سُرخ فیتہ

تیغ نو

سُرخ فیتہ

قدرت اللہ شہاب

بار اول

قیمت فی پرچہ - چھ روپے

۱۹۶۳ء

ریپلیکا پبلیکیشنز
مانڈوی والا لین - پریڈی سٹریٹ
صدر - کراچی
طابع و ناشر - عنایت اللہ آذر

فہرست



سرخ فیتہ

سیکرٹری

جائنٹ سیکرٹری

ڈپٹی سیکرٹری

انڈر سیکرٹری

اسسٹنٹ سیکرٹری

سپرنٹنڈنٹ

مقام ــــ کانفرنس روم
وقت ــــ صبح دس بجے

سیکرٹری :ــمیرے خیال میں کاروائی شروع ہونی چاہئے ۔ ویل ، سپرنٹنڈنٹ صاحب آپ کیس کو وضاحت سے بیان فرمائیے۔

سپرنٹنڈنٹ :ــیس سر ۔ یس سر ۔ جناب کو غالباً یاد ہوگا کہ جب ٹائپسٹ کلرک مس سلیمہ کی تقرری زیر غور تھی ، تو خاکسار نے بصد ادب و احترام عرض کیا تھا ، کہ شاید یہ تجربہ مہنگا پڑے ۔ ذاتی طور پر یہ تابعدار آزادیٔ نسواں کا مخالف نہیں ، بلکہ میں نے ہفتہ وار ''جلترنگ'' اور ماہنامہ ''پروانہ'' میں حقوق نسواں پر بڑے معرکہ کے مضامین لکھے ہیں ۔ اگر جناب والا ارشاد فرمائیں تو

ان کے تراشے پیش کروں؟ اتفاق سے میری جیب میں چلے آئے ہیں۔

جائنٹ سیکرٹری :- یہ بات موضوع سے دور ہے۔ آپ محض کیس بیان کیجئے۔

سپرنٹنڈنٹ :- یس سر۔ جی ہاں۔ میں گذارش کر رہا تھا، کہ ذاتی طور پر خاکسار آزادیٔ نسواں کا مخالف نہیں۔ لیکن اصولی طور پر دولت خداداد پاکستان میں......

سیکرٹری :- آپ، اصولی بحثوں سے برکنار رہنے کی کوشش کیجئے۔ ہم صرف کیس سننا چاہتے ہیں۔

اسسٹنٹ سیکرٹری :- اور جناب اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں عورتوں کا تناسب بحوالہ سرکار نمبر ۳۵۲ الف مورخہ ۱۹ دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء مقرر ہوچکا ہے۔ اب اس موضوع پر کسی قسم کی اصولی بحث کرنا غیر مناسب ہے۔ اگر جناب ضروری خیال فرمائیں، تو سرکار مذکورہ پیش کیا جائے؟

انڈر سیکرٹری :- میرے خیال میں سرکلر پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایسا اہم سرکار تو سب کو از بر ہونا چاہئے۔ افسوس تو یہ ہے کہ حکومت کے احکام پر مناسب عمل نہیں کیا جاتا۔ ورنہ اب تک دفتروں میں حسین چہروں .... میرا مطلب ہے، صنف نازک کو اپنا جائز حصہ مل چکا ہوتا۔ جناب، میں سمجھتا ہوں کہ پیش نظر کیس کی سماعت کے وقت مس سلیمہ کو بھی اس میٹنگ میں موجود ہونا چاہئے۔ اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو اسے بلا بھیجا جائے؟

ڈپٹی سیکرٹری :۔ انڈر سیکریٹری کی رائے نہایت معقول ہے۔ قانونی لحاظ سے اس کیس سے متعلقہ سب لوگوں کو یہاں موجود ہونے کا حق پہنچتا ہے۔

جائنٹ سیکرٹری :۔ یہ دلیل بعید از موضوع ہے ہم ایک محکمانہ معاملے پر غور کر رہے ہیں اور محکمانہ کارروائیاں عدالتی اصولوں کی پابند نہیں ہیں۔

سیکرٹری :۔ میرا رجحان بھی جائنٹ سیکرٹری کی رائے سے متفق ہونے کی طرف آمادہ ہے۔ ویل، سپرنٹنڈنٹ صاحب، بیان جاری رکھئے۔

سپرنٹنڈنٹ :۔ جناب، غلام گذارش کر رہا تھا، کہ خاکسار کی مودبانہ گذارشات کے باوجود جب مس سلیمہ کی تقرری منظور ہوگئی، تو میں نے عرض کی تھی۔ کہ کم از کم اسے میرے سیکشن میں تعینات نہ کیا جائے۔ حضور جانتے ہیں کہ میرے سیکشن میں پہلے ہی سے عجب عجب مخلوط عناصر بھرے ہوئے ہیں، جو کام کی نسبت باتیں اور جھگڑے زیادہ کرتے ہیں۔ مثلاً ناصر علی میر، جو ہونے کو تو بل کلرک ہے، لیکن اندر ہی اندر شاعر بھی ہے۔ اور فائلوں پر اپنی نظموں کی مشق کرنے کا عادی ہے۔ کبھی ہتوڑے پر نظم، کبھی درانتی پر غزل، کبھی سڑک کوٹنے والے انجن کی شان میں قصیدہ۔ اللہ، اللہ! یہ بھی کیا زمانہ آیا ہے، حضور! ورنہ شاعری جیسی صنف لطیف کو ان بھونڈے مضامین سے کیا واسطہ؟ وہ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے فرمایا ہے ع

آتے ھیں غیب سے یہ مضامین خیال میں....
جائنٹ سیکرٹری :— براہ مہربانی آپ شاعری سے ہٹ کر کیس پر رہیئے۔
سیکرٹری :— مجھے اس بات سے قطعی اتفاق ھے۔ ویل ؟
سپرنٹنڈنٹ :— اور جناب میرے سیکشن میں ناصر علی میر کے علاوہ وہ خبطی، سودائی نصرت اللہ خیال بھی ھے۔ جو اپنے آپ کو دور حاضرہ کا بہترین نثر نگار سمجھتا ھے۔ اور......
انڈر سیکرٹری :— میرے خیال میں آپ اپنے سیکشن کا تجزیہ کرنے کی بجائے مس سلیمہ کے متعلق باتیں کرتے جائیں تو بہتر ہوگا۔
ڈپٹی سیکرٹری :— انڈر سیکرٹری کا مطلب ھے کہ آپ اپنی گفتگو کو کیس کے موضوع سے بہت دور نہ جانے دیجئے۔ مجھے اس خیال سے پورا اتفاق ھے۔
سپرنٹنڈنٹ :— جی ھاں۔ بے شک۔ میں عرض کر رھا تھا کہ میرے سیکشن میں پہلے ھی سے مخلوط العناصر مخلوق کی کھچڑی پکی ہوئی تھی۔ اس پر طرہ یہ، کہ مس سلیمہ بھی پوسٹ ہوئی تو اسی سیکشن میں۔ میرے ناچیز خیال میں تنظیمی لحاظ سے یہ ایک غلطی تھی۔
اسسٹنٹ سیکرٹری :— حکومت کے منظور شدہ احکامات پر نکتہ چینی کرنے سے سپرنٹنڈنٹ کو باز رھنا چاھیئے۔
سپرنٹنڈنٹ :— جی ھاں، بہت خوب۔ میں معافی چاھتا ھوں۔ چنانچہ جناب عالی، مس سلیمہ کے آنے پر میرے سیکشن

میں گڑبڑ اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ اور باوجودیکہ . . . . .

اسسٹنٹ سیکرٹری :— کیا مطلب ؟ یعنی کہ آپ کے سیکشن میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ موجود تھی ؟ تنظیمی لحاظ سے یہ اقبال قابل غور ہے۔

انڈر سیکرٹری :— میرے خیال میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ایڈمنسٹریشن کا خاطر خواہ تجربہ نہیں۔ کسی سیکشن میں گڑبڑ کا احتمال تک قابل گرفت ہونا چاہیئے۔ چہ جائیکہ گڑبڑ ہو، اور پھر ہمیشہ سے ہو۔

ڈپٹی سیکرٹری :— سپرنٹنڈنٹ صاحب، یہ فرمائیے، کہ آپ اس پوسٹ پر کب سے مقرر ہیں ؟ اور آپ کی سروس کے پچھلے تجربات کیا ہیں ؟

سپرنٹنڈنٹ :— جی حضور، میں معافی کا خواستگار ہوں۔ دراصل میری گذارش کا مطلب یہ تھا، کہ . . . .

ڈپٹی سیکرٹری :—آپ اپنا مطلب چھوڑئے اور فی الحال میرے سوالوں کا جواب دیجئے۔

سپرنٹنڈنٹ :—جناب عالی، خاکسار نے سنہ ۱۹۲۵ء میں آگرہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ حسن اتفاق سے اسی سال مسٹر جان ایٹن صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ ہوم ڈیپارٹمنٹ حکومت ہند اپنی میم صاحبہ کے ہمراہ تاج محل کی زیارت کرنے آگرہ تشریف لائے۔ خدائے ذوالجلال دونوں کو غریق رحمت کرے، بڑی خوبیوں کے لوگ تھے۔ حسن سیرت سے مالا مال، رحمدل، غریب پرور، تاج محل کے باہر ان کے تانگے کا گھوڑا بدکنے لگا۔ میں کلو پنواڑی

کی دکان کے سامنے بیٹھا بیڑی سلگا رہا تھا۔ ان دنوں کلو پنواڑی کی دکان تاج محل کے عین سامنے والے.....

جائنٹ سیکرٹری :—مجھے شک ہے کہ انتظامی نا اہلیت کے علاوہ اس سپرنٹنڈنٹ کو ضرورت سے زیادہ باتیں کرنے کا بھی مرض ہے۔ یہ دونوں نہایت سنگین نقائص ہیں۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی بنیادوں کو اس قسم کی نا اہلیت اور باتونیت پر استوار کیا جا سکتا ہے، تو یقیناً ہم جنت الحمقا میں رہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس سپرنٹنڈنٹ کی اہلیت کا جائزہ لینے کے لئے مکمل انکوائری کی ضرورت ہے۔

سیکرٹری :—مجھے اس رائے سے حرف بحرف اتفاق ہے۔ نا اہلیت کو دیدہ و دانستہ برداشت کرنا قومی غداری کے مترادف ہے۔ ویل، سپرنٹنڈنٹ صاحب۔ آپ جاسکتے ہیں۔ یہ فائل یہیں چھوڑتے جائیے۔

(سپرنٹنڈنٹ جاتا ہے)

سیکرٹری :—میرے خیال میں اس سپرنٹنڈنٹ کے کام، تجربے اور دیگر کوالی فی کیشنز کا جائزہ لینے کے بعد میرے پاس ایک مفصل نوٹ پیش ہونا چاہئے۔

جائنٹ سیکرٹری :—(ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجئے۔

ڈپٹی سیکرٹری :—(انڈر سیکرٹری سے) آپ اس انکوائری کو اپنی ذاتی نگرانی میں نہایت احتیاط کے ساتھ منعقد کریں۔

انڈر سیکرٹری :—(اسسٹنٹ سیکرٹری سے) اگر اس معاملے میں آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے، تو بلا تکلف مجھے



بتا دیجئے گا۔

اسسٹنٹ سیکرٹری :—بہت خوب۔ کیا اب مس سلیمہ کا کیس آگے بیان کیا جائے؟

انڈر سیکرٹری :—شاید یہ بہتر ہوگا کہ سپرنٹنڈنٹ کی غیر موجودگی میں کیس پر روشنی ڈالنے کے لئے مس سلیمہ کو یہاں بلا لیا جائے؟

جائنٹ سیکرٹری :—جیسا کہ فیصلہ ہوچکا ہے۔ مس سلیمہ کو اس میٹنگ میں بلانے کے لئے کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری فائل سے کیس پر روشنی ڈال سکتا ہے۔

سیکرٹری :—میں جائنٹ سیکرٹری کی رائے کے ساتھ اپنے اتفاق کو دھراتا ہوں۔ ویل، ویل۔ کیس بیان ہو۔

اسسٹنٹ سیکرٹری :—جناب، شکایت کا لب لباب یہ ہے کہ بل کلرک ناصر علی میر، جو اندر ہی اندر شاعر بھی ہے، دفتر میں بیٹھ کر اپنی نظمیں گنگنانے کا عادی ہے۔ اس کی ایک نظم پر سپرنٹنڈنٹ صاحب کو شدید اعتراض ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس نظم کے پہلے حصے میں مس سلیمہ کی طرف رومانی اشارات ہیں اور یہ ایک اخلاقی جرم ہے۔ دوسرے حصے میں حکومت پر حملہ ہے، جو ایک قانونی جرم ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک ادبی جرم یہ ہے کہ نظم سر سے پاؤں تک بے قافیہ اور بے ردیف ہے۔

ڈپٹی سیکرٹری :—جہاں تک سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ادبی اعتراضات کا تعلق ہے، انھیں موضوع بحث سے الگ رکھنا چاہئے۔

انڈر سیکرٹری :—میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مس سلیمہ کے متعلق

رومانی اشارات منظوم کرنا بھی کوئی جرم نہیں ۔ البتہ اگر مس سلیمہ کو خود کوئی وجہ شکایت ہو ، تو دوسری بات ہے۔ اس لئے شروع ہی سے میرا یہ خیال رہا ہے کہ مس سلیمہ کی رائے معلوم کرنے کے لئے اسے اس میٹنگ میں بلانا حد درجہ مناسب ہوگا ۔

جائنٹ سیکرٹری :—مجھے افسوس ہے کہ ہم پیش از مرگ واویلا کر رہے ہیں ۔ نظم سننے سے پہلے اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا ایک مہمل سی بات ہے ۔

سیکرٹری :— بالکل ٹھیک ۔ میری رائے کا پلہ بھی اسی طرف جھکنے کی طرف مائل ہے ۔ ویل، اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب ، آپ نظم بیان فرمائیے ۔

اسسٹنٹ سیکرٹری :—جناب ، نظم کا عنوان ہے ''سرخ فیتہ'' عرض کیا ہے :—

تو نے جب کھایا پان!
تیرے ہونٹوں پہ لگا فیتۂ سرخ ۔
جان جاں ۔
جان جہاں ۔
تیری آنکھوں میں گلابی ڈورے
تیرے گالوں پہ وہ غازے کی بہار
تیرے حلقوم کی شہ رگ میں مچلتا سا ، چھلکتا سا، لہکتا سا ہوا گرم لہو
تیری شلوار پہ ریشم کا ربن ۔
تیرے پر پیچ غرارے پہ گلابی سی عنابی سی کشیدہ کاری۔

ھیہات!
تجھ پہ موقوف ھے کیا؟
جان جاں——جان جہاں
سرخ فیتے میں بندھی رہتی ھے سرکار میری!
اس میں حاکم بھی ھیں محکوم بھی ھیں۔
(خاکم بدھن!)
اس میں ظالم بھی ھیں مظلوم بھی ھیں۔
اس کے ھر پیچ میں پوشیدہ ھے اک دارورسن۔
اس کے پھندے میں لٹکتی ھے، مٹکتی ھے، جھٹکتی ھے ادا
پھانسی کی جس میں سر ڈال کے، آہ
مر گئی فائل میری!

انڈر سیکرٹری :— واہ وا، واہ وا، سبحان اللہ۔ کیا خوب کہا ھے، ظالم نے واہ وا،

ڈپٹی سیکرٹری :— بہت خوب۔ بہت خوب، جیسے ن۔م۔ راشد کا کلام۔

انڈر سیکرٹری :— میرے خیال میں فیض کا رنگ بھی غالب ھے۔ تیری آنکھوں میں گلابی ڈورے— تیری گالوں پہ وہ غازے کی بہار۔ واہ وا۔ واہ وا۔

ڈپٹی سیکرٹری :— کچھ کچھ میرا جی کا اثر بھی نمایاں ھے— ترے حلقوم کی شہہ رگ میں مچلتا سا، چھلکتا سا، لہکتا سا ھوا گرم لہو! آھا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!

جائنٹ سیکرٹری :— کیا آپ صاحبان داد دے چکے؟

انڈر سیکرٹری :— اجی صاحب، ھم کیا اور ھماری داد

کیا—میں نے کہا، آپ نے غور فرمایا، کہ ہمارے دفاتر کی گدڑیوں میں کیسے کیسے لال پوشیدہ ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ جب تک حکومت خود ان گنج ہائے گرانمایہ کو تلاش کرکے . . . . .

جائنٹ سیکرٹری :— مجھے ڈر ہے کہ یہ محکمانہ کارروائی مجلس مشاعرہ کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔

سیکرٹری :— میں خود یہی محسوس کرنے کی کوشش کررہا ہوں ۔ صاحبان ، ہمیں سنجیدگی کا دامن پکڑنا چاہیئے ۔ اس کے بغیر امور سلطنت بعنوان شائستہ طے نہیں کئے جاسکتے ۔

انڈر سیکرٹری۔ڈپٹی سیکرٹری :—بہت خوب ، جناب ۔

سیکرٹری :—ویل ، اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب؟

اسسٹنٹ سیکرٹری :—جناب ، سپرنٹنڈنٹ صاحب کو شکایت ہے، کہ اس نظم کے پہلے آٹھ مصرعوں میں مس سلیمہ پر اشارات ہیں ، اور باقی حصے میں سرکار والا مدار کے نظام کارکردگی کی شان میں گستاخی ہے۔

انڈر سیکرٹری :— کیا اس نظم میں کسی جگہ مس سلیمہ کا نام آیا ہے ؟

اسسٹنٹ سیکرٹری :—جی نہیں ، تو۔

انڈر سیکرٹری :—اس صورت میں یہ شکایت بے بنیاد ہے۔

ڈپٹی سیکرٹری :—اور اگر مس سلیمہ کو یہ خوش فہمی ہے کہ کہ نظموں میں اس کے سوا اور کسی خوبصورت لڑکی کا ذکر نہیں ہوسکتا۔ تو اس وہم کا ہمارے پاس کوئی

علاج نہیں ۔

انڈر سیکرٹری :—اس کے علاوہ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ اشارہ مس سلیمہ کی طرف ہے تو پہلے ہمیں ان امور پر تحقیقات کرنا ہوگی کہ کیا وہ پان کھاتی ہے؟ کیا پان کھانے کے بعد اس کے ہونٹوں پر سرخ فیتے سے لہرانے لگتے ہیں؟ کیا اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہیں؟ کیا اس کے گالوں پر غازے کی بہار ہوتی ہے؟ کیا وہ ایسی شلوار پہنتی ہے جس کے پائنچوں پر سرخ ربن لگا ہو؟ کیا اس کے غرارے پر سرخ ریشم کے پھول ہوتے ہیں؟.... جناب عالی، میں بصد ادب و احترام گذارش کروں گا، کہ جب تک ہم مس سلیمہ کو سامنے بٹھا کے ان امور کا مفصل جائزہ نہ لیں ۔ ہماری انکوائری پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ کم ازکم انصاف کا تقاضہ تو یہی ہے ۔

ڈپٹی سیکرٹری :—بالکل درست ۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے دفاتر میں مس سلیمہ کے علاوہ اور بھی ایسی لڑکیاں ہوں جو پان کھاتی ہوں، جن کے گالوں پر غازے کی بہار ہو ۔ جن کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ہوں ۔

جائنٹ سیکرٹری :—مجھے اس نکتے سے معقولیت کی بو آتی ہے ۔

سیکرٹری :—میرا خیال ہے کہ میں بھی یہی سونگھ رہا ہوں ۔

انڈر سیکرٹری :—جناب، اس صورت میں میں یہ تجویز پیش کرنے کی جرائت کروں گا، کہ مزید انکوائری کے لئے ایک بین الوزارتی میٹنگ منعقد کی جائے، اور اس میں سب محکموں میں کام کرنے والی لڑکیوں کو بھی طلب کیا جائے ۔

جائنٹ سیکرٹری :—میں سمجھتا ھوں کہ اس کی ابھی چنداں ضرورت نہیں لیکن جناب ، جو خیال مجھے دق کر رھا ھے، وہ یہ ھے کہ اگر یہ ثابت بھی ھو جائے کہ یہ نظم مس سلیمہ یا کسی اور دفتری لڑکی کے متعلق ھے، تو کیا ھم کسی قسم کا ایکشن لینے کے مجاز ھوں گے؟

اسسٹنٹ سیکرٹری :—جناب ، کیس کے اس پہلو پر فی الحال غور نہیں کیا گیا ۔ میرا خیال ھے کہ انکوائری مکمل ھونے کے بعد ایکشن تجویز کرنا کوئی مشکل کام نہ ھوگا ۔

سیکرٹری :—بہت خوب! آپ گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنے کے شوقین نظر آتے ھیں ۔ کیا میں دریافت کر سکتا ھوں کہ اس کیس پر ابتدائی کارروائی کا ذمہ دار کون ھے؟

اسسٹنٹ سیکرٹری :—جناب ، ابتدائی کارروائی اس خاکسار نے مکمل کی تھی ۔

سیکرٹری :—مجھے نہایت افسوس سے یہ اعلان کرنا پڑتا ھے کہ آپ نے اس قسم کا مبہم اور نا پختہ کیس ایجنڈا پر رکھ کر ھم سب کا وقت ضائع کیا ھے اگر آپ سمجھتے ھیں کہ حکومت کے قیمتی وقت کو یوں ضائع کر کے آپ ملک اور قوم کی خدمت سر انجام فرما رھے ھیں تو بے شک آپ کسی شدید مجرمانہ غلط فہمی میں مبتلا ھیں ۔ مجھے ڈر ھے، کہ ھمیں آپ کی صلاحیتوں کا از سر نو جائزہ لینا ھوگا۔ اسسٹنٹ سیکرٹری صاحب ، آپ تشریف لے جاسکتے ھیں ۔ یہ فائل یہیں چھوڑ جائیے ۔

(اسسٹنٹ سیکرٹری جاتا ھے)

سیکرٹری :—(جائنٹ سیکرٹری سے) آپ اسسٹنٹ سیکرٹری کی صلاحیتوں کا بغور جائزہ لے کر مجھے ایک تفصیلی نوٹ عطا فرمائیں تو مشکور ہوں گا ۔

جائنٹ سیکرٹری :—(ڈپٹی سیکرٹری سے) آپ اس کام پر اپنی خاص توجہ صرف کیجئے ۔

ڈپٹی سیکرٹری :—(انڈر سیکرٹری سے) اگر آپ کو کسی پوائنٹ پر میری مدد کی ضرورت محسوس ہو ، تو بلا تکلف فرمادیجئے گا۔

انڈر سیکرٹری :—بہت خوب ، جناب ۔ کیا اب مس سلیمہ کا کیس مزید بیان کیا جائے ؟

جائنٹ سیکرٹری :—میں سمجھتا ہوں کہ یہ نا پختہ کیس محض تضیع اوقات ہے ۔ میری رائے میں اسے داخل دفتر کر دینا چاہیے ۔

سیکرٹری :—میں محسوس کرتا ہوں کہ میری رائے کا پلہ بھی اس تجویز کے حق میں جھکاؤ کی طرف مائل ہونے پر آمادہ ہے ....

ریلوے جنکشن

"کتنی چھٹی پر آئے ہو؟" نثار نے چھوٹتے ہی بغیر کسی علیک سلیک کے پوچھا۔

"پندرہ دن کی" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔ چلو اس بار تمہیں لاہور کی زمین دوز مال گاڑیاں دکھائیں گے" نثار نے فیصلہ صادر کیا۔

"میں سیر کرونگا" وہ کچھ دیر سوچ کر ۔ ۔ ۔ مشفقانہ انداز سے کہتا ہے۔ "تم کہانیاں لکھنا"۔

یہ لائحہ عمل ہم دونوں کے حسب منشا ہے۔ چنانچہ شام ہوتے ہی نثار مجھے مال روڈ پر ایک ہوٹل میں لے گیا ہوٹل کے لان میں ہم کمال بے حیائی کے ساتھ ایک ایسی میز پر جا ڈٹے جہاں پہلے سے ایک دو ایڈیٹر۔ چند نامہ نگار۔ کچھ ریڈیو آرٹسٹ۔ کچھ ادیب اور چند گرگ باراں دیدہ صورت کے سیاسی حضرات براجمان تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ ایک صاحب کولڈ ٹی نوش جاں فرما رہے ہیں۔ یہ کولڈ ٹی اس گرم چائے سے مختلف ہے جو گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور جسے معمولی ذہانت کے انسان

پیا کرتے ہیں۔ یہ مشروب خاص لاہور کی ایجاد ہے۔ اور دستور کے مطابق اس ایجاد کی ماں بھی ضرورت ہے وہ ضرورت پرو ہیبشن کی وجہ سے اکثر حضرات کو پوشیدہ امراض کی طرح لاحق ہو گئی ہے۔

دانشوروں کی اس محفل پر پوسٹ مارٹم کے کمرے کی فضا بڑی شدت سے چھائی ہوئی ہے قوم کی لاش سامنے ٹیبل پر پڑی دھری ہے۔ اور ہر شخص اس کا کوئی نہ کوئی عضو ہاتھ میں لئے بڑی چابکدستی کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے میں منہمک ہے۔ روحانی، جسمانی، ایمانی، اور سیاسی امراض سے لیکر خود کشی کے نفسیاتی اسباب تک بڑی تندھی سے تشخیص ہو رہے ہیں۔ علاج تجویز ہوتے ہیں۔ نسخوں پر گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ میز پر مکے پڑتے ہیں۔ کرسیاں الٹتے الٹتے بچتی ہیں ـــ لیکن اس وقت قوم کی ساری بیماریوں کا واحد علاج صرف اس چائے دانی میں ہے۔ جس میں کولڈ ٹی بڑی احتیاط سے محفوظ ہے۔ کولڈ ٹی والے صاحب پیالی منہ سے لگائے مزے مزے کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ اور اپنے اردگرد کف در دھن مسیحاؤں کے طوفان بدتمزی کے باوجود بڑی لاتعلقی سے داغ کی ایک عشقیہ غزل گنگنا رہے ہیں۔

"آج سینما کا پروگرام ہے؟" کولڈ ٹی صاحب نثار سے پوچھتے ہیں۔

"جی نہیں آج دوسرے پروگرام ہیں" نثار میری طرف

اشارہ کر کے دوسرے کے لفظ پر خاصی زور دیتا ہے۔

''ھوں!'' کولڈ ٹی صاحب عینک اتار کر مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے گھورتے ہیں۔ ''نثار تم نے ابھی ان کیا تعریف کی تھی؟ کس جگہ کے میونسپل کمشنر ہیں یہ؟''

نثار قہقہ لگا کر ان کی تصیح کرتا ہے۔ ''میونسپل کمشنر نہیں، بھائی یہ برخوردار ڈپٹی کمشنر ہے ڈپٹی کمشنر

کولڈ ٹی صاحب قطعی مرعوب نہیں ہوتے۔ ٹھیک ہے وہ بڑے مربیانہ انداز سے فرماتے ہیں۔ ''اس نازک زمانے میں ایک آدھ ڈپٹی کمشنر کو ہاتھ میں رکھنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔''

پھر وہ کمال شفقت کے ساتھ میری ڈھارس بندھاتے ہیں ''برخوردار تم بے فکر رہو میں لاھور میں تمہاری موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرونگا۔ انشاالله۔''

''یہ بچہ لاھور کی زمین دوز مال گاڑیاں بھی دیکھنا چاھتا ہے۔'' نثار مودبانہ گزارش کرتا ہے۔ ''یہ ان پر کہانیاں لکھے گا۔'' ''تم کہانیاں بھی لکھتے ہو؟'' کولڈ ٹی صاحب اس انداز سے پوچھتے ہیں جیسے کہانیاں لکھنا کوئی بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔ ''کہاں لکھتے ہو؟'' میں خجالت سے منمنا کر ''نقوش'' ''سویرا'' ''ساقی'' ''ھمایوں'' ''ادبی دنیا'' وغیرہ کے نام لیتا ہوں۔

''یہ رسالے کہاں چھپتے ہیں؟ میں نے تو نہیں دیکھے'' کولڈ ٹی صاجب کی نظر میں میری ادبی پوزیشن گر جاتی ہے

وہ اپنی عینک دوبارہ آنکھوں پر لگا لیتے ہیں ۔ اور مشفقانہ انداز میں مجھے یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر مجھے کہانیاں لکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو شمع، ڈائرکٹر اور چنگاری میں لکھا کروں، کولڈ ٹی کا آخری پیالہ حلق میں انڈیل کر وہ ان رسالوں پر اپنی گرانقدر رائے کا اظہار بھی فرماتے ہیں ۔

اس مختصر سی علمی و ادبی بحث کے بعد جب ہم ہوٹل سے نکل کر ایک تانگے میں سوار ہوتے ہیں ۔ تو نثار اور کولڈ ٹی صاحب کا تانگے والے سے تبادلۂ خیالات شروع ہو جاتا ہے ۔ تانگے والا بڑی مشتاقی سے اپنے فنون لطیفہ کا پرچار کرتا ہے ۔

زمیندار اخبار کے عقب میں رہنے والی جو انگریزی بولتی ہے ـــــ چوبرجی والی جس کا رنگ گورا اور بال سنہری ہیں ـــــ میو گارڈن والی جو اسی سال میٹرک میں فیل ہوئی ہے ـــــ گھوڑا ہسپتال کے پاس والی جو لتا منگیشتر کی طرح گاتی ہے ـــــ ماڈل ٹاؤن والی جو ایک ہسپتال میں نرس ہے ـــــ لیکن نثار اور کولڈ ٹی صاحب تانگے والے کے پراپیگنڈے سے بالکل متاثر نہیں ہوئے

"تم سالے باسی کڑی کا ابال ہو۔" کولڈ ٹی صاحب خفا ہوتے ہیں ۔ تم سے تو مزنگ کے اڈے کے تانگے والے ہزار درجہ اچھے ہیں ـــــ تانگے والا مزنگ کے اڈے والوں کو فصیح و بلیغ گالیاں دے کر ڈرامائی انداز

سے اپنا تازہ ترین شاہکار برآمد کرتا ہے۔ "لڑکی کیا ہے صاحب۔ نرا آلو بخارا ہے۔ ابھی کالج میں پڑھتی تھی فقط دو مہینے سے اس لائن میں آئی ہے۔ اب تک صرف چار مرتبہ باہر گئی ہے۔ کالے خاں پٹھان نے پورے سات سو روپے دئیے تھے۔ تمہاری خاطر سے دو سو میں منا لونگا۔ چلوں؟"

آلو بخارا کے نام سے نثار اور کولڈ ٹی صاحب کی رال بھی ٹپکنے لگتی ہے۔ لیکن دو سو روپے کا ذکر سن کر ان کے جبڑے لٹک جاتے ہیں۔ وہ دونوں امید افزا نظروں سے مجھے گھورتے ہیں۔ خاص طور پر کولڈ ٹی صاحب کے انداز بڑی شدت سے للکار رہے ہیں۔ برخوردار دیکھو میں تمہیں اپنی خدمت، کا سنہری موقعہ دے رہا ہوں۔ اگر تم اس وقت کام نہ آسکے تو ڈپٹی کمشنر نہیں گھسیارے ہو۔۔ لیکن میرے انداز ہیں کہ انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہیں اور وہ مایوس ہو کر پھر اپنا جبڑا لٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔

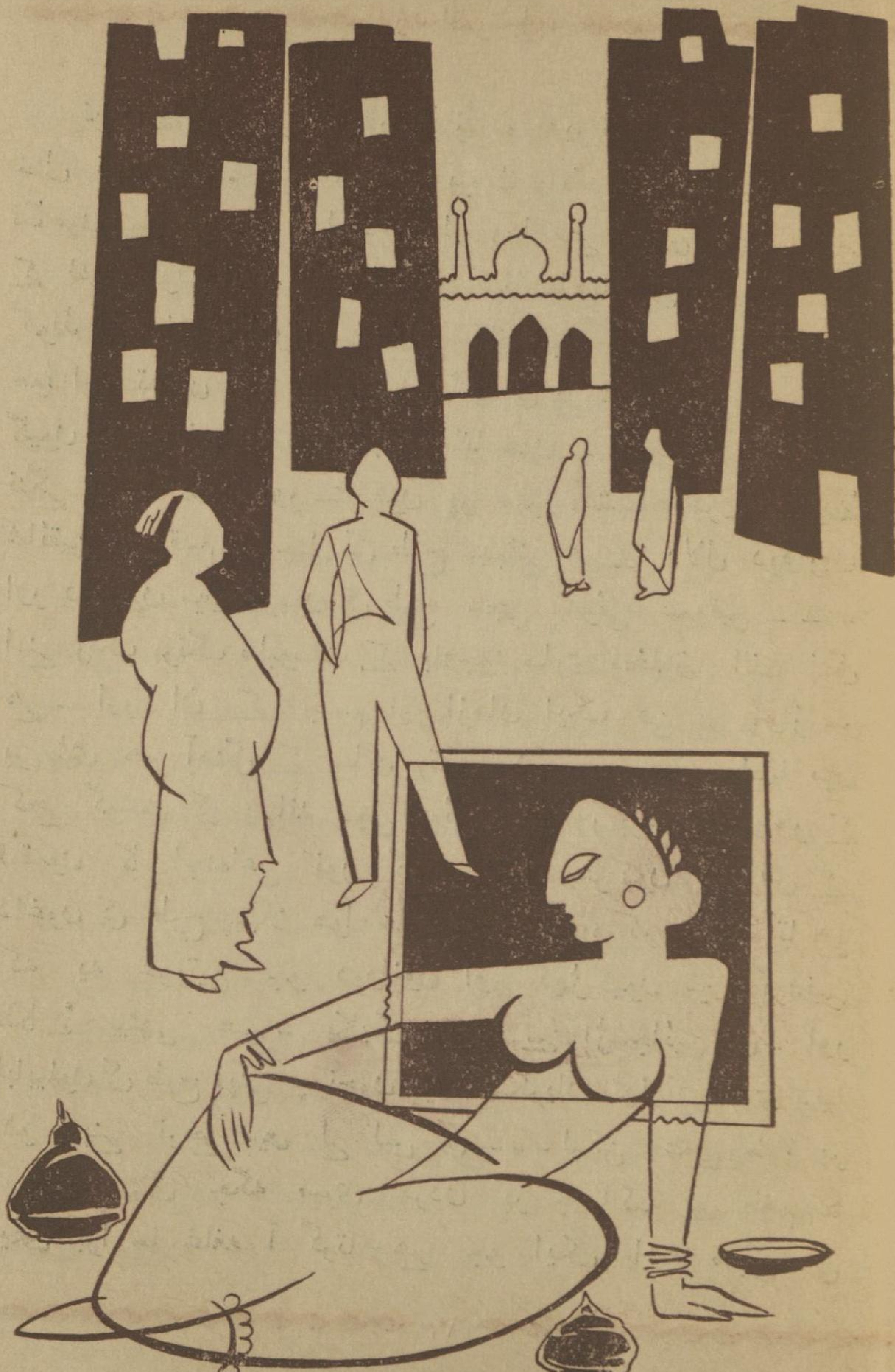
اس خاموش کولڈ وار کے بعد موضوع سخن بدل جاتا ہے تانگے والا گھوڑے کو مخاطب کر کے ہمیں بڑی سنگین اور پیچ دار گالیاں سناتا ہے۔ نثار اپنے جگری دوستوں کی تعریف کرتا ہے جو ضرورت کے وقت اسپر کئی ہزار روپیہ تک خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور کولڈ ٹی صاحب پاکستان کے جملہ افسروں کی کمینگی، نالائقی اور بدیانتی پر جی کھول کر تبصرہ فرماتے ہیں۔ یوں بھی رفتہ رفتہ کولڈ ٹی اپنا رنگ دکھا رہی ہے اور جب تانگے والا گھوڑے کی وساطت

سے ہمیں چند الوداعی گالیاں سنا کر ہیرا منڈی میں نوگزے کی قبر کے پاس اتار دیتا ہے۔ تو کولڈ ٹی صاحب کے پاؤں بڑی شدت سے لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ ''س'' کو ''ش'' میں بدل کر بڑی خوش سگالی سے چوک میں کھڑے ہوئے پولیس کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہیں۔ ''شوپائی جی شلام۔ جیتے رہو۔''

سپاھی نتھنے پھیلا کر کولڈ ٹی کے منہ کو قریب سے زور لگا کر سونگھتا ہے۔ ''اچھا! آج بھی خوب چڑھا رکھی ہے صاحب۔ پرمٹ کہاں ہے؟''

کولڈ ٹی صاحب فتح مند مرغ کی طرح چھاتی نکال کر اپنا ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھاتے ہیں۔ غالباً وہ مجھے پرمٹ کے طور سپاہی کی خدمت میں پیش کرنے والے ہیں۔ لیکن میں نظر بچا کر کھسک جاتا ہوں۔ اور نوگزے کی قبر کی اوٹ میں جا چھپتا ہوں۔

مجھے غیر موجود پا کر کولڈ ٹی صاحب کی چھاتی کا تناؤ ڈھیلا پڑھ جاتا ہے۔ اور وہ اپنی شرٹ کی جیبیں ٹٹول کر پانچ روپے کا نوٹ کانسٹیبل کے ھاتھ میں دے دیتے ہیں۔ کانسٹیبل اس پرمٹ سے مطمئن ہو کر چلا جاتا ہے۔ نثار اور کولڈ ٹی صاحب کی گرمیٔ گفتار سے ظاھر ہوتا ہے۔ کہ اس وقت ان کے درمیان میری ذات کا مسئلہ زیر غور ہے وہ کچھ دیر میرا انتظار کرتے ہیں اور پھر غصے سے ایک طرف چل کھڑے ہوتے ہیں۔



نوگزے کی قبر کے پاس زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں ہے ۔ کیونکہ وہی پرمٹ والا سپاہی اب مشتبہ نگاہوں سے بار بار میرا جائزہ لے رہا ہے ۔ میں واپس لوٹنے کے لئے کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں جہاں نثار کولڈ ڈی صاحب اور پرمٹ والے کانسٹیبل سے میرا سامنا نہ ہو، اس تلاش میں میں ہیرا منڈی کی بے شمار پیچ در پیچ گلیوں کے تانے بانے میں الجھ جاتا ہوں ۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں ۔ گلیوں اور سڑکوں پر مٹر گشت کرتے ہوئے شائقین قدم قدم پر چیل کی طرح جھپٹتے ہوئے دلال دروازوں اور دریچوں میں گڑیوں کی طرح سجی ہوئی عورتیں ۔ ۔ ۔ اپنے رنگ برنگ ملبوسات کے باوجود ساری مخلوق الف ننگی ہے ۔ اور ان کے جسم اور ازہان ایک ہی بے آواز سر پر بڑی ہم آہنگی کے ساتھ رقص کر رہے ہیں ۔ فضا میں کچے گوشت کی بساند رچی ہوئی ہے ۔ اور بڑی بڑی پاور کے قمقموں کا اجتماعی نور گلیوں اور سڑکوں پر برص کے داغوں کی طرح پھیلا ہوا ہے ۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ یہ عورتیں جو دروازوں اور کھڑکیوں میں گردنیں لٹکائے بیٹھی ہیں ۔ یکایک پھر سے اڑ جائیں گی ۔ اور ابابیلوں کی طرح اپنی چونچوں میں کنکریاں اٹھا کر ساری دنیا کو اپنے نرغے میں لے لیں گی ۔ ۔ ۔ لیکن عملی طور پر کنکریوں کی جگہ میری گردن پر جھپاک سے بلغم کا ایک بڑا سا غلفہ آ گرتا ہے جو ایک ادھ موئی سی

عورت دریچے میں بیٹھی بڑے اطمینان سے کھنکار کھنکار کر نیچے تھوک رہی ہے۔ میں اپنی گردن کو اس غلاظت سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہوں، تو خدا کی خاص رحمت میری دستگیری فرماتی ہے اور ایک گلی میں مجھے مسجد نظر پڑتی ہے، جس کے ایک دروازے پر کالی سیاہی سے ''یااللہ'' اور دوسرے دروازے پر ''یا محمد'' لکھا ہوا ہے۔ یہ چھوٹی سی مسجد دو بلند و بالا عمارتوں کے درمیان بڑی بیکسی سے جکڑی کھڑی ہے۔ اندر پیشاب اور پاخانے کا تعفن ہے ایک طرف نالی میں بیئر کی چند خالی اور شکشتہ بوتلیں اوندھی پڑی ہیں۔ وضو کے لئے ایک پرانا حمام ہے۔ جس کا پانی لعاب دھن کی طرح کثیف ہے باسی اور بڑے زوروں سے ھمک مارتا ہے۔ نہ جانے اس مسجد کو دیکھ کر میرے دل میں ریل کے انجن کا خیال کیوں آتا ہے، جو تیز رفتاری سے چلتا چلتا اچانک پٹری سے اتر گیا ہو!

ہیرا منڈی سے بھٹکتا بھٹکتا آخر میں شاہی مسجد آ پہنچتا ہوں اور خدا کی کھلی فضا میں اطمینان سے زور زور سے سانس لینے لگتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے بھی مسجد کے آس پاس کئی شاندار کاریں کھڑی ہیں۔ اور ان کے ڈرائیور ادھر ادھر بے دلی سے بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ یہ شرفاء کی موٹریں ہیں۔ جو اپنی بیگمات سے اجازت لیکر شاہی مسجد میں آہ نیم باشی یا اقبال کے مزار پر ھدیہ عقیدت پیش کرنے

یہاں آیا کرتے ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ مسجد کی چکنی سیڑھیوں پر اکثر ان کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ لڑھکتے لڑھکتے بے اختیار ہیرا منڈی کے نہاں خانوں میں جا گرتے ہیں ۔ اگر اقبال زندہ ہوتا یہ مسئلہ جبر و قدر کی ایک نئی تفسیر منظوم کر سکتا تھا ۔

شاہی مسجد کے عین مقابل پرانے قلعے کی وہ اونگھتی ہوئی عمارت ہے۔ جس کے صدر دروازے پر پاکستان کا جھنڈا کسلمندی سے لہر رہا ہے۔ اقبال کے مزار میں ایک چھوٹا سا بلب روشن ہے۔ بڑا بلب کچھ عرصہ ہوا کہ چوری ہو گیا تھا ۔ لاہور میں بجلی کے نئے بلب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے ۔ کیونکہ ان کی مانگ ہیرا منڈی میں بہت زیادہ ہے چنانچہ اقبال کے مزار کو ایک چھوٹے سے بلب پر ہی قناعت شعار ہونا چاہئیے ۔۔ مزار کے دروازے پر ایک آہنی قفل لگا ہوا ہے تا کہ عقیدت مند اندر گھس کر سوچ بورڈ نہ چرا سکیں ۔ ۔ ۔ ۔ باہر لان میں ہیرا منڈی کے اکا دکا دلال بھولے بھٹکے راہئیوں کے لئے خضر راہ کا کام دینے کے منتظر بیٹھے ہیں ۔ ایک تانگے والا دو آنے میں داتا کے دربار پہنچانے کا اعلان کرتا ہے اور میں اچک کر اس میں سوار ہو جاتا ہوں ۔ تانگے میں ضلع جہلم کے دو مقدمہ باز بھی بیٹھے ہوئے ہیں ۔ دن بھر مقدموں اور کچہریوں کی زحمت کے بعد وہ گھڑی دو گھڑی دل بہلانے کے لئے ہیرا منڈی آ گئے تھے ۔ اور اب حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ

کے آستانہ پر سلام کرنے جا رہے ہیں ۔

"کرتا تو سب کچھ اللہ ہی ہے" ایک مقدمہ باز اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے ۔ "لیکن بزرگوں کا سہارا بھی بڑی چیز ہوتی ہے" :-

دوسرا مقدمہ باز بھی اس نظریئے کی تائید کرتا ہے ۔ اور اس روحانی گفتگو کے بعد وہ دونوں سوگوشیوں میں ھیرا منڈی کے ذاتی تجربات پر تبادلۂ خیالات کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔

جمعرات کی وجہ سے داتا کے دربار میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا بے پناہ ھجوم ہے ۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور دربار کے صدر دروازے میں نثار اور کولڈ ٹی صاحب ھاتھ میں ھاتھ ڈالے چست کھڑے ھیں ۔ ھجوم کے ھر ریلے کے ساتھ وہ خس و خاشاک کی طرح بہتے ہوئے اندر چلے جاتے ھیں ۔ اور پھر دیکھتے ھی دیکھتے واپس آ کر صدر دروازے کے عین بیچ اپنی جگہ سنبھال لیتے ھیں ۔ میں ھر چند کوشش کرتا ھوں کہ ان کی نظر بچا کر ادھر آدھر ھو جاؤں ۔ لیکن نثار مجھے دیکھ لیتا ہے ۔ اور زبردستی کھینچ کر اپنے پاس کھڑا کرلیتا ہے ۔ کولڈ ٹی صاحب بھی میری پچھلی لغزشوں کو فراموش کر کے بڑے اخلاق سے پیش آتے ھیں اور داتا دربار کے ساتھ مسلمان عورتوں کی عقیدت مندی کے جملہ فوائد پر عارفانہ روشنی ڈالتے ھیں ۔ اپنے پروگرام کے مطابق یہ لوگ اب یہاں سے مزنگ کے اڈے

پر جائیں گے - اور وہاں سے زمین دوز مال گاڑیوں کی دوسری منزل شروع ہو گئی - لاہور نارتھ ویسٹرن ریلوے کا بہت بڑا جنکشن ہے - یہاں کی زمین دوز مال گاڑیاں ہر سڑک ہر گلی ہر کوچے میں چلتی ہیں - جگہ جگہ سرخ بتیوں کے نشان ٹمٹماتے ہیں - لیکن ان بتیوں کے باوجود کئی گاڑیاں کانٹا بدلتے بدلتے چوک جاتی ہیں - اور اکثر تصادم کے حادثات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں - اگر کوئی تیز رفتار انجن چلتے چلتے پٹڑی سے اتر جائے تو آسے پھینک نہیں دیا جاتا - بلکہ اس کی پیشانی پر اللہ اور رسول کا نام لکھ کر آسے مسجد کے کام پر لگا لیا جاتا ہے - - - - -

سردار جسونت سنگھ

سردار جسونت سنگھ کے لئے حسن ابدال کی سردارنی آنند کور کی بڑی لڑکی کے متعلق نامہ و پیام شروع ہونے والا تھا لیکن جسونت سنگھ نہ ہاں کرتا تھا نہ ناں ۔ اس کی وجہ سے بڑی نازاں اور پیچیدہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی ۔ گھر کے علاوہ ساری اہلوو الیہ برادری میں اس پر کافی اضطراب تھا ۔

سردار جسونت سنگھ اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا انگریزی موسیقی کے چند نئے ریکارڈ بجا رہا تھا ۔ نیچے دالان میں سردار گوردیال سنگھ روز نامہ گورو گھنٹال کے مطالعہ میں مشغول تھے ۔ سردار جسونت سنگھ کی ماں اپنے بڑے بچے کی اس بے روا روی پر بڑا خشمگیں تبصرہ کر رہی تھیں اور کوشلیا نہایت ہمت سے کام لے کر بھائی کی وکالت کر رہی تھی ۔

”بھابوجی“ ۔ کوشلیا نے اپنی ماں سے شکایت کی ۔ ”آپ تو یونہی غصے میں آ جاتی ہیں ۔ بھرا تاجی نے آخر کونسا ایسا جرم کر دیا ہے ، کہ آپ اتنے دنوں سے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں ۔“

”ہاں ، ہاں ، جی ۔ میں تو اس کی دشمن ہوں نا ۔“

بھابو جی نے ڈانٹ بتائی ۔ ”ایک تم ہی رہ گئی ہو، اس کی بڑی ہمدرد ۔ وہ جوتے لگاؤنگی کہ مزاج درست ہو جائے گا کالے منہ والے کا ۔“

”ہائے بھابو جی ۔ کچھ تو خیال کیجئے ۔ پڑھا لکھا جوان بیٹا ہے ۔ ۔ ۔ ۔“

”آگ لگے ایسی پڑھائی لکھائی کو ۔ خبر نہیں ولایت میں کیا کیا کالا علم سیکھ کر آیا ہے ۔ میں نے تو پہلے کہا تھا کہ اتنے پاؤں نہ پھیلاؤ ۔ لیکن تمہارے بھائیا جی پر تو ولایت کا بھوت چڑھا ہوا تھا ۔ اب روتے رہو آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے ، ہاں ۔“

”بھابو جی ، آخر کونسی ایسی آفت آگئی ہے ۔ شادی بیاہ کی بات ہے ۔ بھرا تاجی کی بات سننے میں آخر ہرج ہی کیا ہے ؟“

”میں نہیں جانتی کہ کیا ہرج ہے اور کیا نہیں ہے ۔ اب کل کو تمہاری بات چیت ہو گی ۔ تو تم بھی بات کرنے بیٹھنا ۔ بے شرم کہیں کی ۔“

”اوہو ۔ بس بھی کرو ۔“ سردار گوردیال سنگھ زچ ہو کر بولے ۔ ”مجھے ذرا اخبار تو پڑھنے دو ۔“

”بس تم اخبار ہی پڑھتے رہنا ۔ جیسے بڑی سردارنی بیٹھ کر تمہارا انتظار ہی تو کرتی رہیگی ۔“

”نہیں انتظار کرتی، نہ کمرے ۔ میں کب ہاتھ جوڑ کر اس کے پاس گیا تھا ۔“

''اے ہے، واھگورو مہاراج سے ڈرو - لڑکیوں والوں کے متعلق ایسی بات نہیں کیا کرتے - ذرا اپنی طرف بھی دیکھ لو لاٹھ کی لاٹھ جوان بیٹی بیٹھی ہے- واھگورو مہاراج سے ڈر کے رھو-''

''تم تو یونہی مغز کھاتی رھتی ھو-''

''میں مغز نہ کھاؤں تو کیا کروں - آخر کیا کھوٹ ھے بڑی سردارنی کی بیٹی میں ؟ میموں جیسی رنگت ھے- ناک ھے- نقشہ ھے - روپ ھے جب ملتی ھے پاؤں چھو کر ملتی ھے - پڑھی لکھی ھے- اور پھر حسن ابدال میں آموں کے دو باغ اور تین چاھی مربع بھی اس کے نام لگے ھوئے ھیں -''

''لیکن شاید وہ بھرا تاجی کو پسند نہ ھو - کوئی زبردستی تھوڑی ھے -'' کوشلیا نے احتجاج کیا -

''پسند کیوں نہ ھو؟ یہ لاٹ صاحب کا بچہ اور کیا مانگتا ھے ؟ کوئی میم بھی نہ لے آیا ولایت سے، ھاں-'' بھابو جی بڑے غصے میں تھیں -

''بھابو جی واھگورو کا شکر کرو، کہ کوئی میم ویم نہیں آگئی اگر آ جاتی تو ساری عمر کا رونا پیٹنا پڑا رھتا گھر میں -'' کوشلیا نے کہا -

''اب کونسی ھنسی خوشی ھے یہاں- میرے تو بھاگ ھی ایسے ھیں - بڑی سردارنی سے ناطہ ٹوٹے گا، تو میرا - برادری میں تھو تھو ، تھی تھی ھو گی، تو میری - یہ تمہارے بھائیا جی تو جیسے نہ لینے میں ھیں نہ دینے میں -'' بھابو جی

نے اب پھر سردار گوردیال سنگھ کی طرف توجہ مبذول کر لی وہ بدستور روز نامہ ''گوردو گھنٹال'' کے مطالعہ میں منہمک تھے۔ آج کے پرچے میں شرد ھنی اکلی دل، گوردوارے پر بندھک کمیٹی اور - - - - - - کی سیاسی کاروائیوں پر بڑی گرما گرم بحث تھی -

سردار جسونت سنگھ کی ماں نے جب دیکھا، کہ اس کے الفاظ کی سختی یا نرمی سے سردار گوردیال سنگھ کے کان پر جوں تک بھی نہیں رھنیگی، تو اس نے حسب معمول اپنا آخری حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا، جو خاص ایسے نازک موقعوں کے لئے محفوظ رھتا تھا ۔ اپنی قسمت کی خرابی، اولاد کی ناخلقی اور خاوندکی ظالمانہ بے توجہی پر پنجابی زبان کے مخصوص محاروں، بندشوں اور ترکیبوں کے ساتھ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بھی گرنے لگے ۔ سردار گوردیال سنگھ بدستور اخبار ''گورو گھنٹال'' کے مطالعہ میں مصروف رھے۔ اور جب ان کی بیوی کی گریہ و زاری نے ایک مستقل ھچکی کا رنگ اختیار کر لیا، تو اپنے معمول کے مطابق انہوں نے اخبار کو تہ کر کے تکیے کے نیچے رکھا ۔ عینک اتار کر چمڑے کے کیس میں حفاظت سے بند کی، اور چار پائی پر اکڑوں بیٹھ کر اپنی زوجۂ محترمہ کی طرف متوجہ ھوئے ۔

''میں نے کہا بھاگوان یہ کیا ٹنٹا ھے؟''

''ھاں جی ۔ میری تو ھر بات ٹنٹا ھوتی ھے۔'' بھابو جی نے تنک کر کہا ۔ ''تم اپنا اخبار پڑھتے رھو۔ تمہیں کیا

واسطہ گھر بار سے۔"

سردار گوردیال سنگھ مسکرائے۔ "بھاگوان، گھر بار تو سب تمہارا ہے۔ مجھے اس کی فکر کیوں ہو۔ ہاں، اب بتاؤ بات کیا ہے۔"

"ہائے، ہائے۔ ابھی تک کوئی بات ہی نہیں ہوئی؟ جیسے کچھ سنا ہی نہیں تم نے۔"

"سن تو لیا۔ لیکن اگر لڑکا راضی نہ ہو، تو بھاگوان تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"ہائے جی، تم کچھ نہیں کر سکتے؟ پاؤں سے کھول کر دس جوتے لگا دو تو وہ کالے منہ والا اپنے آپ سیدھا ہو جائیگا۔"

کوشلیا اب تک خاموش بیٹھی تھی۔ جسونت سنگھ کے بارے میں یہ تجویز سن کر وہ گھبرا گئی اور سردار گوردیال سنگھ سے کہنے لگی۔ "دیکھو نا بھائیا جی۔ یہ بھابو جی بھی کیا کیا باتیں کرتی ہے۔ بھلا بھرا تاجی کو مارتے آپ اچھے لگتے ہیں؟"

سردار گوردیال سنگھ کو یہ منظور نہ تھا کسی وقت ان کی اولاد کو یہ خیال بھی آئے کہ وہ اپنے والد بزرگوار کے جوتوں کی زد سے باہر ہیں۔ اس لئے انہوں نے کوشلیا کو ذرا سختی سے جھڑک دیا۔ "کوشلیا بیٹی۔ ڈنڈا استاد ہے بگڑیاں تگڑیاں دا! دیکھنا کہیں تمہارا بھرا تاجی اس خیال میں نہ رہے، کہ اس کے منہ پر دو بال آگ آئے ہیں،

تو میرے جوتوں کے تلے بھی بیکار ہو گئے ہیں۔"

"ہاں جی، ذرا دیکھو تو۔" بھابو جی نے لقمہ دیا۔ "اب یہ بھی بیچ میں بولنے لگی ہے۔ بڑی آئی ہے بھائی کی وکیل بن کر۔ میں کہتی ہوں کہ اس کا نام بھی کالج سے کٹوا لو۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں سر پکڑ کر رونا پڑے۔ ہاں۔"

"اجی چھوڑو اس بک بک کو" سردار گوردیال سنگھ تعلیم کے سلسلے میں بڑے روشن خیال باپ تھے۔ "تم بھی کیا گنواروں ایسی باتیں کرنے لگتی ہو۔ آخر کچھ تو بتاؤ تو سہی، کہ جسونت کہتا کیا ہے؟"

"میں کیا بتاؤں؟ میں تو گنوار ہوئی نا" بھابو جی نے نخرہ کیا۔ "تمہارے سامنے بیٹھی ہے پڑھی لکھی لاڈلی۔ اسی سے کیوں نہ پوچھ لو۔"

"کوشلیا بیٹی تمہاری بھابو کا تو سر پھر گیا ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ آخر جسونت سنگھ کا خیال کیا ہے۔"

"بھائیا جی۔" کوشلیا نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کے، ڈرتے ڈرتے، ہچکچاتے ہچکچاتے کہا۔ "بھرا تاجی کہتے ہیں کہ نہ میں لڑکی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ نہ لڑکی مجھ سے پوری طرح واقف ہے۔ میں اس شادی کی حامی کیسے بھروں۔"

"اس ناڈھو خاں کے سالے کو ایسی لڑکی کہاں سے ملے گی جسے وہ اندر باہر سے خوب جانتا ہو؟ سنتی ہو کوشلیا



کی بھابو - یہ تمہارا لال کیسی منطق بگھارنے لگا " - سردار گوردیال کو اپنے بیٹے کی اس بات پر بڑا غصہ آیا -

"میں تو کب سے اپنا سر پیٹ رہی ہوں - لیکن تم ہو کہ کوئی بات مزاج میں ہی نہیں لاتے - میں کہتی ہوں، کہ دس جوتے لگا دو، تو سارے بل نکل جائینگے -"

"بھائیا جی" - کوشلیا نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی - "اس میں غصہ کھانے کی کیا بات ہے بھلا؟ بھرا تا جی کہتے ہیں کہ ولایت میں کورٹ شپ کا جو رواج - - -"

یکایک فضا میں ایک پٹاخہ سا چھٹا - اور سردار گوردیال سنگھ سانپ کی طرح پھنکار کر کھڑے ہو گئے - یہ انداز اس بات کی تمہید تھے، کہ اب سردار گوردیال سنگھ اپنے ایام تحصیلداری کے تجربات کا نچوڑ کام میں لانے والے ہیں - پہلے انہوں نے کھڑے ہو کر ولایت اور ولایت والوں کے متعلق بڑے شدید خیالات کا اظہار کیا - پھر جسونت سنگھ کی ماں کی سات پشتوں کو بڑے وسیع پیمانے پر گالیاں دیں - اور اس کے بعد جوتا ہاتھ میں لے کر وہ جسونت سنگھ کے کمرے کی طرف لپکے - عین اسوقت باہر گلی میں موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی پھٹ پھٹاہٹ سنائی دی - اور جسونت سنگھ جو اوپر اپنے کمرے میں بیٹھا ساری کاروائی کا جائزہ لے رہا تھا، موقعہ کی نزاکت بھانپ کر فرار ہو گیا! اب بھائیا جی اور بھابو جی کی مجموعی توجہ غریب کوشلیا کی طرف رجوع ہو گئی ان دونوں نے مل کر کوشلیا کو بڑے آڑے ہاتھوں لیا -

اور ان کے غصے کی تان آخر اس فیصلے پر آ کے ٹوٹی کہ کوشلیا کا نام کالج سے کٹوا دیا جائے ۔ تا کہ کل کلاں جب اس کے رشتے کی بات چیت شروع ہو ، تو کہیں وہ بھی اپنے بھائی کے نقش قدم پر چل کر کورٹ شپ کا سوال نہ اٹھائے ۔

"خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے ، بھاگوان" سردار گوردیال سنگھ نے اپنی اہلیہ محترمہ سے اتفاق کیا "اس سے تو تم جیسی گنوار عورت ہی اچھی ۔"

"ہاں جی ، ہاں ۔ میں تو گنوار ہوں نا ۔ بس بیٹھے رہو ڈھکے ہوئے ۔ اپنی اوقات سے بڑھنا اچھا نہیں ہوتا ۔ اب دیکھ لو اپنی اولاد کے لچھن ۔ ساری اہلو والیہ برادری میں ناک نہ کٹ گئی ، تو دیکھنا ۔ ہاں ۔"

"بس اب یہ ٹر ٹر بند بھی کرو ۔ میں نہیں ڈرتا سالی برادری سے رہی جسونت سنگھ کی بات ۔ میں جوتے مار مار کر اسے تکلے کی طرح سیدھا کرلونگا ۔ ایک گلاس ٹھنڈی لسی کا پلاؤ ۔ برف منگوالینا بازار سے ۔"

سردار گوردیال سنگھ نے لسی پی کر اپنا غصہ ٹھنڈا کیا بھابو جی نے تازہ مکھن کا پھاھا تالو پر رکھا ۔ کوشلیا اپنے کمرے میں بستر پر پڑی ساری رات روتی رہی ۔ جسونت سنگھ گورڈن کالج کے ہوسٹل میں ترلوچن سنگھ کے کمرے میں بیٹھا اپنی کورٹ شپ کا لائحہ عمل مرتب کرتا رہا ۔

سردار جسونت سنگھ کو حسن ابدال کی سردارنی کی بڑی لڑکی کوئی خاص نا پسند نہ تھی ۔ ولایت جانے سے پہلے اگر

یہ پیام آتا تو غالباً وہ خوشی سے پاگل ہوجاتا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر گوردوارے کے صحن میں سر کے بل کھڑا ہو کر بکرے بلاتا ۔ ۔ ۔ لیکن اب اصولی طور پر وہ اس رشتے کو ایک بے زبان جانور کی طرح چپ چاپ قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا ۔ ولایت میں کورٹ شپ کی رسم نے اُسے بہت متاثر کیا تھا ۔ اسی اثر کے تحت اسی نے اپنی بہن کوشلیا اور ترلوچن سنگھ کے عشق میں بڑا مہذبانہ دخل دینا شروع کر دیا تھا ۔ اور اپنے لئے بھی وہ اس بات کا متمنی تھا کہ شادی سے پہلے وہ اپنی منتخب لڑکی کے ساتھ کچھ عرصہ کورٹ شپ کرے ۔ آج گھر میں اپنے بھائیا جی اور بھابو جی کے ذہنی اور جسمانی انداز دیکھ کر اُسے یقین ہوگیا تھا کہ چاہے وہ سیدھی طرح مانے یا الٹی طرح ، اگر اس کی شادی ہوگی تو حسن ابدال کی بڑی سردارنی کے گھر ہو کر رہیگی ۔ بھائیا جی کو اگر کورٹ شپ والی شرط معلوم نہ ہوتی ، شاید وہ اس شادی پر حد سے زیادہ زور نہ دیتے ۔ لیکن بھابو جی کے سر پر جو آموں کے دوباغات اور تین چاہی مربعوں کا بھوت سوار تھا ۔ اس کے اترنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی ۔

اپنی مجبوریوں کے اس ماحول میں سردار جسونت سنگھ ۔ کو روشنی کی صرف ایک کرن نظر آتی تھی ۔ وہ یہ تھی کہ حسن ابدال کی بڑی سردارنی کے ہاں چار لڑکیاں ہونے کی وجہ سے اس دائرہ انتخاب کافی وسیع ہونے کے امکانات تھے ۔ اگرچہ ابھی بات چیت صرف بڑی لڑکی کے متعلق چلی تھی لیکن اسے

یقین تھا کہ اگر اس کی نظر انتخاب پھسلنے پر آمادہ ہوئی تو پہلی سے دوسری، دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی لڑکی پر کہیں نہ کہیں ضرور اٹک جائیگی۔ اسے انگریزی کا ایک مقولہ یاد آیا جو اس نے لندن میں سوھو کے ایک ریستوران میں کسی سے سنا تھا ۔ " اگر تمہارے سامنے ایک لڑکی ھے تو تم اپنا دل کھو بیٹھوگے ۔ اگر تمہارے سامنے دو لڑکیاں ھیں ، تو تمہارے دل اور دماغ دونوں کھو جائینگے ۔ اگر تین لڑکیاں ھیں، تو جان کی بھی خیر نہیں ۔"

" میرے یار" سردار جسونت سنگھ نے ترلوچن سنگھ کے کندھے پر ھاتھ مار کے کہا ۔ " یہاں پر تو ایک ساتھ چار چار ھیں ۔ بس یہ سمجھو کہ اب میرے دل ، دماغ ، کلیجی پھیپھڑے اور گردوں کی خیر نہیں !"

ان سب (Calculations) کے بعد سردار جسونت سنگھ نے حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی بڑی لڑکی کے نام انگریزی میں ایک (Formal) خط لکھا :

محترم خاتون ۔

آپ کے اور میرے خاندانوں نے فیصلہ کرلیا ھے، کہ نظام عالم کو برقرار رکھنے کے لئے یہ لازمی ھے ، کہ ان کا رابطہ ایک شادی سے مستحکم کیا جائے ۔ اس خدمت کے لئے اھلوں نے آپ کو اور مجھے منتخب کیا ھے ۔ اصولی طور پر میں (Arranged) شادیوں کے حق میں نہیں ۔ اگر اعلی تعلیم نے آپ پر کچھ اثر کیا ھے، تو غالباً آپ کا بھی یہی خیال ھوگا

کورٹ شپ کے ایک لفظ نے ہمارے گھرانے میں کہرام مچادیا ہے میں آپ کو یہ لفظ دہرانے کا مشورہ نہیں دونگا مبادا کہ آپ کی والدہ محترمہ پر بھی وہی ذہنی اور اعصابی رد عمل ہو جو میرے بزرگ والدین پر گزر چکا ہے۔

اگر آپ اسے نا مناسب نہ سمجھیں ، تو ہم کچھ عرصہ آپس میں خط و کتابت کر کے کورٹ شپ کا نعم البدل پاسکتے ہیں ۔ اگر میں آپ کی دائمی رفاقت کا اعزاز حاصل نہ کرسکوں ، تو براہ مہربانی مجھے اپنی چھوٹی بہنوں کے ساتھ قسمت آزمائی کا موقع عطا فرمائیے جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں نظام عالم کی سلامتی کے لئے یہ نہایت ضروری نظر آتا ہے کہ ہمارے معزز خاندان آپس میں شادی کی زنجیر کے ذریعے مستحکم ہو جائیں ۔ اس زنجیر کی ایک کڑی یہ خاکسار ہے دوسری کڑی فراہم کرنے کے لئے آپ چاروں میں سے ایک کو اپنی قربانی دینا ہوگی۔

خدا حافظ ۔

آپکا وفادار
جسونت سنگھ

غم جاناں

۱ — شاعر
۲ — افسانہ نگار
۳ — مصور

شاعر — کیا لکھ رہے رہو ؟

افسانہ نگار — خاک ۔

شاعر — بڑا دلچسپ موضوع ہے ۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں کہ اس زمین میں کچھ فکر سخن کروں ۔

مصور — اپنا بھی یہی ارداہ ہے ۔ جب تک خاک کا تصور نہ کیا جائے ، طبیعت کسی رنگ پر جمنے ہی نہیں پاتی ۔

شاعر — آؤ مل کے خاک کی باتیں کریں۔ یا خس وخاشاک کی باتیں کریں ۔ ۔ ۔

افسانہ نگار — تسلیمات ! صاحبو ، آپ دونوں گدھے ہیں ۔

شاعر — واللہ ! خوب یاد دلایا ۔ ابھی کل میں نے "نوائے خر" کے نام سے ایک شاندار نظم کہی ہے ۔ بند عرض کیا ہے ۔

مجھ سے پہلی سی مشقت مرے مزدور نہ مانگ !
اور بھی کام ہیں دنیا میں مشقت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں بوجھ کی راحت کے سوا

تو جو مل جائے! اکیلا تو دولتی جھاڑوں
خاک میں تجھ کو لٹا کے تیرے کپڑے پھاڑوں
مجھ سے پہلی سی مشقت مرے مزدور نہ مانگ

مصور — میرا اگلا شاہکار بھی اسی حسین و جمیل چوپائے پر ہو گا۔ کیوب ازم کے نظریات کے مطابق جو فنی صلاحیتیں گدھے میں پائی جاتی ہیں، وہ کسی دوسرے جاندار میں نہیں ہیں۔

افسانہ نگار — میرا خیال ہے کہ گدھے کے بعد آپ حضرات بندر پر طبع آزمائی فرمائیں گے۔

مصور — بے شک۔ سرریلزم میں آرٹ کا کمال یہ ہے، کہ ہر سبجیکٹ کو اس کی مرکزی حقیقت کے قریب ترین لایا جائے۔ حضرت انسان کی مرکزی اصلیت بندر کے نزدیک پہنچ کر بہت واضح ہو جاتی ہے۔

شاعر — سرسوں کے ہرے کھیت میں اٹھلائے بندریا
بیلوں کو جتے دیکھ کے اترائے بندریا
مسکائے بندریا
شرمائے بندریا
بل کھائے بندریا۔۔۔۔۔۔

مصور — میں تو یہی رائے دونگا، کہ اگر آپ اپنے فن کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے افسانوں

میں بندر کو اس کا مناسب منصب ضرور دیجئے۔

افسانہ نگار ۔ نہ صاحب مجھے بخشئے۔ میں ابھی اللہ کی نعمتوں سے اس درجہ محروم نہیں ہوا کہ بندر کی طرف رجوع کر دوں ۔

مصور ۔ خیر، آپ کی مرضی۔ صحیح رائے دینا میرا فرض تھا۔ اگر آپ کو بندروں سے دلچسپی نہیں، تو مینڈک اور مرغ بھی بڑے شاداب موضوع ھیں۔

شاعر ۔ مرغ پر اس خاکسار نے ایک مسدس کہا تھا۔ ٹیپ کا بند ملاحظہ فرمائیے۔

صبحدم خواب سے دنیا کو جگائیں تو ھم
نیند کے ماتوں کو تکبیر سنائیں تو ھم
تیرے گھر بار کی رونق کو بڑھائیں تو ھم
تیرے دالان کو بیٹوں سے سجائیں تو ھم
پھر بھی اٹھتے ھی چھری ھم پر چلائی تو نے
حیف یہ رسم وفا خوب نبھائی تو نے

افسانہ نگار ۔ صاحبو، یہ بندر، گدھے، مینڈک اور مرغ آپ کو مبارک ھوں۔ مجھے ان حسین و جمیل موضوعات سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ھے۔

شاعر ۔ غالباً آپ نے داستان طرازی کا مشغلہ ترک کر دیا ھے؟

افسانہ نگار ۔ جی نہیں۔ میں خدا کے فضل سے اب تک

افسانے لکھتا ہوں اور خوب لکھتا ہوں ۔

مصور ۔ اگر آپ کو زندگی کے ان ٹھوس حقائق سے دلچسپی نہیں، تو شاید آپ الف لیلیٰ کے شہزادوں ، جنوں کے بادشاہ اور کوہ قاف کی پریوں کی کہانیاں لکھنے کے شوقین ہونگے؟

افسانہ نگار ۔ جی نہیں خدا میری جمیلہ کو سلامت رکھے ۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے جنوں کے بادشاہ یا کوہ قاف کی پریوں کا سہارا لینے کی مطلقاً حاجت نہیں ۔

شاعر ۔ ہائے کیا نام لے لیا ظالم نے !

مصور ۔ زندگی کے خوابیدہ تار جھنجوڑ ڈالے اس نام نے ۔

شاعر ۔ ہائے، کیا بات ہے جمیلہ کی ۔ ایک زمانہ تھا، کہ اس کی رنگ برنگ چوڑیوں کی کھنک سے شعریت کے طوفان ابلتے تھے ۔

مصور ۔ اس کے جسم کے اقلیدسی خطوط اور اس کی گھنیری بھوؤں کی سیاہ جھالریں میرے شاہکاروں کی معراج تھیں ۔

شاعر ۔ اس کی لانبی لانبی۔ کمر تک بل کھاتی ہوئی زلف کا تصور میری شاعری کی جان تھا ۔

مصور ۔ میں نے اس کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر ابھارنے کی خاطر اپنے فن کو کمال تک پہنچا



دیا۔

شاعر — لیکن ہائے! جب سے جمیلہ نے اپنی زلف دوتا کٹوا کر بوبڈ ہیئر رکھ لئے ہیں، میری شاعری مر گئی۔

مصور — اب وہ اپنی جھالر دار بھویں استرے سے مونڈ کر ان کی جگہ سرمے کی تنی ہوئی لکیریں کھینچتی ہے۔ میرے شاعر میرا فن برباد ہو گیا۔

شاعر — میرے پیارے افسانہ نویس، تم اس لنڈ منڈ جمیلہ پر جتنی کہانیاں چاہو لکھتے رہو۔ اب اس میں میرے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔

افسانہ نگار — تم دونوں بڑے کور ذوق عاشق ہو۔ جس نکتے پر آکر تمہارا فن مر گیا ہے، وہاں سے میرے آرٹ کی ابتدا ہوتی ہے۔ اگر تم نے جمیلہ کی رعنائیوں کو ایک نظر دیکھنا ہے، تو آؤ میرے ساتھ چلو میں تمہیں طلسم ہوشربا کے نظارے دکھاؤں گا۔

شاعر — کہاں چلو گے؟

افسانہ نگار — بوٹ کلب۔

مصور — قی! مجھے وہاں جا کر ابکائیاں آتی ہیں میں نے کئی مہینے وہاں کی خاک چھانی ہے۔

اور جب کبھی وہاں جاتا ہوں، تو میرا جی چاہتا ہے کہ قصاب کی دوکان پر لٹکی ہوئی گوشت کی ننگی رانوں کی تصویر کشی کروں۔

افسانہ نگار — اگر تمہیں کچے گوشت سے اسقدر نفرت ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں میٹروپول کی رقص گاہ میں لے چلوں گا۔ وہاں جمیلہ کے لچکیلے بدن کو رنگین غباروں کی طرح رقصاں دیکھ کر تمہارا دل شاد اور روح منور ہو جائیگی۔

شاعر — میرے دوست! خدا کے لئے مجھے وہاں کی یاد نہ دلاؤ۔ وجدان کی تلاش میں وہاں کئی کئی راتیں جاگا ہوں۔ لیکن ہر بار وہاں جا کر میری شاعری کا جوہر خاک ہو جاتا ہے جب میں جمیلہ کو ہنسی خوشی ہر دوست اور دشمن کے ساتھ باری باری دوش بدوش، بازو بہ بازو، سینہ بہ سینہ رقص کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، تو میری شاعری میں رقیب روسیاہ کا لطیف تخیل فنا ہو جاتا ہے۔

مصور — اب وہ میرے اسٹوڈیو میں ماڈل بننے بھی نہیں آتی۔ بلکہ فوٹو گرافروں کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے۔ تا کہ اس کی تصویریں اخباروں کے پچھلے صفحات پر شائع ہوں۔

شاعر — اس کے فلیٹ میں بجلی کی گھنٹی لگی ہوئی ہے۔ اور مجھے بھی دربان کی جھڑکیاں سہنے اور اس کی منت سماجت کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔

مصور — میرے نزدیک جمیلہ کا وجود نیست و نابود ہو چکا ہے۔ اب میں اس کی یاد میں اپنے آرٹ کو نئی نئی شاہراہوں پر چلا رہا ہوں۔ جب مجھے جمیلہ کی خوبصورت اور سڈول ٹانگوں کا خیال آتا ہے، تو رنگوں کی آمیزش سے چونے اور سیمنٹ کے مضبوط ستون بناتا ہوں جب مجھے اس کے حسین چہرے کی یاد ستاتی ہے، تو میں ایکس رے کے فوٹو کی طرح ہڈیوں کے ڈھانچے کی تخلیق کرتا ہوں —

افسانہ نگار — صاحبو، مجھے آپ دونوں کی حالت پر رحم آتا ہے۔ میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں جمیلہ کی ایک بالکل نئی اور اچھوتی جھلک دکھاؤں گا۔

شاعر — میں خوب جانتا ہوں، کہ اب تم ہمیں کسی ریفیوجی کالونی چلنے کی دعوت دو گے!

مصور — میں وہاں ہرگز نہیں جاؤنگا۔ میرے ڈبوں کے سارے رنگ ختم ہو گئے ہیں، لیکن ہندوستان سے آنے والے ریفیوجیوں کی تعداد میں کمی

نہیں ہونے پاتی ۔ میرا آرٹ اس رفتار کا ساتھ دینے سے بالکل قاصر ہے ۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں ۔

شاعر — — میں نے ابھی اس کوچے کی ھیرا پھیرا کی ہے ، اور کئی بار اسی تانک جھانک میں پٹا بھی ہوں ۔ نا صاحب ، اب وہاں جانے سے میری توبہ ھی بھلی ۔

افسانہ نگار — تم بڑے بزدل انسان ہو ۔ میری طرف دیکھو ۔ کتنی بار میں نے خود جوتے کھائے ھیں ، لیکن میں ابھی تک رفیوجیوں پر افسانے لکھنے سے باز نہیں آیا ۔

شاعر — — تمہارا کیا ہے ۔ تم تو بے حیا ہو ۔ ہر روز جوتے کھاتے ہو اور پھر کپڑے جھاڑ کر افسانہ لکھنے بیٹھ جاتے ہو ۔ لیکن شاعر کا دل بڑا نازک ہوتا ہے ، میرے یار ۔ ذرا سی ٹھیس لگنے سے یہ آبگینہ ٹوٹ جاتا ہے ۔ تم شوق سے جا کر جوتے کھاؤ ، اور افسانے لکھو ۔ میں یہاں بیٹھ کر "اونٹ گاڑی" پر اپنی نظم مکمل کرونگا ۔ اور میرا دوست مصور لنگور کی لہراتی ہوئی بانکی زلف دوتا — توبہ معاف کیجئے گا ، لنگور کی لہراتی ہوئی بانکی دم کی نقاشی کریگا ۔ آہا ہا ، سبحان اللہ کیا

غضب کے شعر ہیں - عرض کیا ہے :

اونٹ پھر آیا دل زار ! نہیں اونٹ نہیں !
یہ تو گاڑی ہے کہیں اور چلی جائے گی -
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا پاؤڈر کا غبار
پھڑپھڑانے لگے شانوں پہ ترا شیدہ بال
- - - - - - - - - - - - - -
- - - - - - - - - - - - - -

زوبی

بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہے، کہ جب ٹیلیفون کے تاروں میں ایک نغمہ سا لہراتا ہے، جب ریسیور میں ایک پائل سی ناچتی ہے، تو وہ زوبی کی آواز ہوتی ہے۔ جس وقت وہ سوچ بورڈ کا بٹن دبا کر "نمبر پلیز؟" پوچھتی ہے، تو بہت سے صاحب دل نمبر بتانے کی جگہ درد دل، درد جگر اور غم جاناں کی داستان سنانے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ زوبی کی آواز میں ایک عجب پیار، ایک عجب سوز، ایک حسین بے تکلفی ہے، جو سننے والوں کے درد ہائے نہانی کو بے ساختہ چھیڑ دیتی ہے۔ اور انہیں دعوت دیتی ہے کہ مجھے اپنا غم بتاؤ، مجھے اپنے زخم دکھاؤ، شاید کہ میں تمہارے کسی کام آسکوں۔ ٹیلیفون کے تاروں میں زوبی کی آواز یوں چھن چھن کر آتی ہے جیسے رستے ہوئے زخموں اور جلتے ہوئے ناسوروں پر الٹرا وائلٹ شعاعیں پڑ رہی ہوں۔ لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ادھر زوبی نے پوچھا "نمبر پلیز؟" اور ادھر نمبر کی جگہ نام بتایا گیا۔ اور نام کے بعد فرمائش ہوئی کہ "ڈارلنگ، تمہارا پیارا نام کیا ہے؟" "سویٹی، تمہاری ڈیوٹی کتنے بجے

سے کتنے بجے تک ہوتی ہے؟" "آج شام پکچر؟" - ایسے موقعوں پر زوبی سوچ بورڈ سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور پھر کئی کئی گھنٹے تک ٹیلیفون کے تار اس کی آواز کی موسیقی کے بغیر ویران رہتے ہیں۔ اور بنی نوع انسان ان بنفشی شعاعوں کی مسیحائی سے محروم ہوجاتی ہے۔

جس ایکسچینج میں زوبی کام کرتی ہے، وہاں ٹیلیفون کے کوئی سات سوا سات سو نمبر ہیں - ٹیلیفون آپریٹروں کی تعداد چھ ہے۔ دو مرد اور چار لڑکیاں۔ زوبی کے علاوہ مس پروین اور مس ڈی سوزا جوان اور خوبصورت لڑکیاں ہیں - چوتھی کا نام مس پری جمال ہے - مس پری جمال کے نام میں جو لطافت ثلاثہ ہے، وہ صریحاً جھوٹ ہے۔ دھوکا ہے - فریب ہے۔ نہ تو وہ مس ہے، کیونکہ اس کی شادی ہوئے بارہ برس ہوچکے ہیں اور وہ دو لڑکیوں اور تین لڑکوں کی ماں ہے۔ نہ ہی اسے کسی زاویہ خیال سے پری کہا جاسکتا ہے۔ اور جمال اگر اس کے شوہر نامدار کا لقب ہو تو خیر، ورنہ وہ جمال سے بھی اتنی ہی دور ہے جتنی کوہ قاف سے - تاہم اسے اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور ابھی تک کسی نے محکمۂ ٹیلیفون کے پاس اس امر کے خلاف احتجاج نہیں کیا - ان چاروں کے علاوہ ایکسچینج میں دو مرد ہیں - ان کی حیثیت اخباری ضمیموں کی سی ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی خاص حادثہ در پیش نہ آئے ان کا وجود بیکار اور بے سود سا رہتا ہے۔ دن بھر وہ اپنے اپنے سوچ بورڈ کے سامنے بیٹھ کر پان چباتے ہیں - بیڑی پیتے ہیں۔ لڑکیوں کو گھورتے

ھیں - اور کبھی کبھی مس پری جمال کے ھونے والے چھٹے بچے کا نام منتخب کرنے میں بھی مدد دیتے ھیں - ان میں سے ایک تیرتھ رام فیروز پوری، کے ترجمہ کئے ھوئے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوقین ھے - اور دوسرا اپنے فرصت کے لمحات میں تعزیرات ھند کی ایک کہنہ سال، بوسیدہ جلد کا مطالعہ کیا کرتا ھے - یہ بات نہیں، کہ خدانخواستہ اسے کسی کچہری وچہری سے واسطہ پڑتا ھے، یا پڑنے کا احتمال ھے - بلکہ وہ ٹیلیفون کے نمبروں کا تعزیرات ھند کی مختلف دفعات سے مقابلہ کرنے کا بے حد شوقین ھے - اور اس عمل سے اسے ٹیلیفون والوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق حیرت انگیز انکشافات کرنے میں ید طولیٰ حاصل ھے -

علم ھندسہ کی یہ نئی صنعت ایکسچینج والوں کا محبوب مشغلہ ھے - اور اس کی مدد سے انہوں نے بہت سے معززین شہر کے جسمانی، دماغی، جنسی اور روحانی رجحانات کی نسبت عجیب و غریب نظریات قائم کر رکھے ھیں - چنانچہ ٹیلیفون نمبر ۱۲۱ والے قاضی ابو المحاسن برکات جو مسجدوں میں شریعت لا کے متعلق لکچر فرماتے ھیں ان کے متعلق یہ پیشن گوئی ھے کہ وہ کسی روز خطبہ بغاوت ارشاد فرمانے کے بعد کالے پانی کی راہ لیں گے - چوھدری عبدالعزیز، ڈسٹرکٹ سول سپلائی افسر کو بے تکلفی سے رشوت لینے کا حق پہنچتا ھے - کیونکہ ان کے ٹیلیفون کا نمبر ۱۶۱ ھے - اور ۴۹۸ نمبر والے سردار حشمت اللہ خان سوز اپنی خوبصورت سرخ سنگر کار میں جو ھر روز ایک

نئی حسینہ اڑائے پھرتے ہیں، وہ یقیناً دوسرے لوگوں کی بیویاں ہوتی ہونگی! اسی طرح ٹیلیفون نمبر ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۲۰ والے بزرگوں کی نسبت بھی ریسرچ کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ لیکن جس وقت نمبر ۳۰۲ کی باری آتی ہے، تو ایکسچینج کی جیوری میں شدید اختلاف رائے پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ ٹیلیفون ڈاکٹر نسیمہ اختر کے نرسنگ ہوم میں نصب ہے اور تعزیرات ہند کی رو سے اس پر قتل کا جرم عائد ہونا چاہئے۔ مس پری جمال کا خیال ہے کہ یہ ٹیلیفون نمبر غلط جگہ لگا ہوا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر مس نسیمہ اختر تو بڑی شریف النفس، سلیقہ شعار، نیکدل خاتون ہے۔ مس پری جمال اپنی زچگی کے سیزن اسی کے نرسنگ ہوم میں گزارا کرتی ہے۔ اور اس نے وہاں کبھی کسی قسم کا گول مال نہیں دیکھا۔ البتہ اگر اسے شکایت ہے، تو بھاری فیس کی ہے جو ہر بار اس بے چاری کی پیٹھ توڑ کر رکھدیتی ہے۔ اگر مس پری جمال کے کمر ہوتی تو یقیناً اس جگہ کمر ٹوٹنے کا محاورہ زیادہ فصیح ہوتا۔ لیکن حقائق کو زبان کی صحت پر قربان نہیں کیا جاسکتا! اس لئے اس کے برعکس دوسرے مرد آپریٹر کی رائے ہے، کہ ڈاکٹر مس نسیمہ اختر کے ٹیلیفون پر ۳۰۲ کا نمبر یوں فٹ آتا ہے، جیسے اس کے بدن پر ۳۸ انچ چھاتی والا بلاؤز یا اس کے پاؤں میں باٹے کا ۵ نمبر والا سینڈل۔ یہ تفصیلات آس نے ڈاکٹر نسیمہ کی پوربن آیا سے بڑی کاوش سے فراہم کی ہیں۔ کیونکہ وہ اسی کے محلے میں رہتی ہے، اور کبھی کبھی پان بیڑی کے لئے پیسے وصول

کرنے چوری چھپے اُس کے ہاں بھی آجایا کرتی ہے۔ اس آپریٹر کا نظریہ ہے، کہ ڈاکٹر مس نسیمہ کو قاتل نہ سمجھنا بھی حد درجہ کی بے ذوقی اور کور مذاقی ہوگی۔ کیونکہ۔ تیری آنکھیں نہیں یہ تو تیر ہیں! اور یہ مصرعہ گاتے گاتے اس کے منہ سے پانوں کی پیک میں غلطیدہ رال ٹپک ٹپک کر منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے ناولوں کو رنگین سے رنگین تر کرنے لگتی ہے۔ البتہ ڈاکٹر نسیمہ کے نرسنگ ہوم اور اس کے سنگین ٹیلیفون نمبرکی رمز اگر کوئی سمجھی ہے تو مس ڈی سوزا ہی پوری طرح سمجھتی ہے۔ کیونکہ ایکبار اس نے بھی چند ہفتے اس کی نرسنگ ہوم میں گزارے تھے۔ اور اس نے یہ راز بڑی مشکل سے محض مس پروین کو بتایا تھا۔ چنانچہ وہ دونوں اپنے اپنے سوچ بورڈوں پر جھک کر ایکدوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتی ہیں، اور چپکے چپکے مسکراتی ہیں۔ جیسے موقعہ واردات پر ملزم کو پکڑ کر پولیس کا تھانیدار اپنی لانبی گھنی مونچھوں کے درمیان کامیابی سے مسکرائے!

زوبی ان قانونی موشگافیوں میں حصہ نہیں لیتی۔ اور نہ ہی اُسے دوسرے لوگوں کے جسمانی یا روحانی غلافوں کے نیچے جھانکنے کا شوق ہے۔ البتہ اُسے اس امر پر ایک گونہ اطمینان ہے۔ کہ ایکسچینج کے نجومی ۱۱۷ نمبر ٹیلیفون پر اپنی قانونی دوربینیں لگانے سے قاصر ہیں۔ ایک روز اس نے چوری چوری تعزیرات ہند میں دفعہ نمبر ۱۱۷ تلاش کرنے کی کوشش کی،

جیسے کوئی شرمیلی کنواری چھپ چھپ کر دیوان حافظ سے اپنے منگیتر کے نام پر فال نکالے ۔ لیکن زوبی نے دیکھا کہ یہ نمبر تو قانون کی دسترس سے بھی باہر ہے ۔ ہر جرم سے پاکیزہ ہے ۔ ہر الزام سے بری ہے ۔ ہر گناہ سے بلند ہے ۔ اور اس خیال سے اس کے گالوں پر کچھ فخر ، کچھ حیا، کچھ سرور کی سرخی غازے کی طرح پھیل گئی ۔ کچھ ایسی ہی سرخی مس ڈی سوزا کے چہرے پر بھی نمودار ہوا کرتی ہے ۔ لیکن اسی روز جب اس کے باپ سے بچی ہوئی رم کی بوتل اس ہتھے چڑھ جائے ، یا اس نے کیفے ہلال میں ڈانس اور تمبولا کے لئے جانا ہو ۔ جس روز مس پروین کے منہ پر گلابی ڈورے جھلک رہے ہوں تو وہ پکار پکار کر کہا کرتے ہیں کہ آج ۔ تار گھر کی سیڑھیوں پر ٹیلیفون سپروائزر نے اسے زبردستی چوم لیا ہے ۔ مس پری جمال کے چہرے پر خون کی نمایاں گردش عام طور پر ایک نئے برخودار کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے ۔ لیکن جب زوبی کے گالوں پر شفق کھلے ، جب اس کے ہونٹوں پر گلاب کی پتیاں بکھر جائیں ، جب اس کی آنکھوں میں کنول کے پھول تیرنے لگیں تو آسمان کے فرشتوں اور جنت کی حوروں کے سوا اور کوئی نہیں پہنچان سکتا ، کہ اس وقت ٹیلیفون نمبر ۱۱۷ کے تار میں ایک نغمہ سا لہرا رہا ہے، ایک پائل سی ناچ رہی ہے، اور زوبی اپنے سوچ بورڈ پر جھکی ہوئی پوچھ رہی ہے، ”نمبر پلیز ؟“

وہ نمبر بتاتا ہے ۔



زوبی نمبر دہراتی ہے۔
"شکریہ!" وہ کہتا ہے۔

اور ان چار فقروں کے سحر سے ایک نئے آدم ایک نئی حوا اور ایک نئی جنت کی تخلیق مکمل ہوجاتی ہے۔ زوبی کو یقین سا ہو چلا ہے کہ یہ ٹیلیفون اسی جگہ ہے جہاں اسے ہونا ہی چاہئے تھا۔ جس طرح تعزیرات ہند والے آپریٹر کو یقین ہے کہ اگر اس شہر میں ۷۸۶ نمبر والا ٹیلیفون بھی ہوتا، تو وہ ضرور جامعہ مسجد میں نصب کیا جاتا!

زوبی کا پورا نام زبیدہ ہے۔ زبیدہ رحیم بخش۔ زوبی محض بے تکلفی اور پیار کا نام ہے۔ چونکہ بیشتر حضرات اس سے بے تکلف ہونے اور پیار کرنے کے شدت سے قائل ہیں، اس لئے عموماً اُسے زبیدہ کی جگہ زوبی ہی کہا جاتا ہے۔ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد اس نے پرائیویٹ میٹرک کیا۔ اور آجکل وہ ایف۔ اے۔ کی تیاری کر رہی ہے۔ اُسے کسی چیز سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اور اس نے کبھی ٹیلیفون پر چوری چوری دوسرے لوگوں کی گفتگو سننے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ اگر مس پروین اور مس ڈی سوزا کھلم کھلا اپنے تجربات پر تبصرہ نہ کیا کرتیں، تو غالباً زوبی کو ساری عمر یہ معلوم نہ ہوسکتا کہ جس وقت خان صفدر علی ٹیلیفون پر سیٹھ ہمت شاہ کی بیگم صاحبہ سے کچھ کہہ رہا تھا کہ "آج آپ دونوں غریب خانہ پر کھانا تناول فرمائیں" تو اصل میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "آ شام

خالی ہے۔ سیٹھ صاحب دورے پر جا رہے ہیں۔ رات کے آٹھ بجے جم خانہ کے باہر انتظار کرونگا"۔ اسی طرح ٹیلیفون کی اصطلاح میں زکام کا مطلب درد دل ہوتا ہے۔ مسجد سے سینما کا کام لیا جاتا ہے۔ گھر سے کلب مقصود ہے۔ لائم جوس سے وسکی کا پہلو نکلتا ہے اور موسم کی گرمی سردی میں حسن یار کی باتیں ہوا کرتی ہیں۔ یہ باتیں اپنے دزدیدہ رومانوں کی قوس قزح سے ایکسچینج کی فضا کو رنگین کر جاتی ہیں۔ انہیں سن کر مس پروین کی پلکیں اس کی آنکھوں پر بوجھل ریشمیں پردوں کی طرح گر جاتی ہیں۔ مس ڈی سوزا کے ہونٹ آتشدان کے سامنے پڑے ہوئے گلدستے کی طرح تمازت کھا کر خشک ہوجاتے ہیں۔ اور کسی وقت مس پری جمال بھی دم بھر کے لئے ایام زچگی کی عبرت انگیزیاں بھلا کر اپنے ماحول کی ترنگ میں بہہ نکلتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے، کہ ایک ٹیلیفون نے دوسرے ٹیلیفون کو گلے لگانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ ایک ریسیور نے دوسرے ریسیور کے ہونٹ چومنے کی کوشش کی تو اس وقت ایک قیامت سی آ جاتی ہے۔ ٹیلیفون کے تاروں میں بجلیاں سی کڑکنے لگتی ہیں۔ سوچ بورڈوں کی چابیاں الجھنے لگتی ہیں۔ اور مس ڈی سوزا اور مس پروین بے تاب ہو کر ایک دوسرے کی انگلیاں کاٹنے لگتی ہیں۔ ایک دوسرے کے بال نوچتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے بلاؤز تک تار تار کر ڈالتی ہیں۔ کسی وقت مس پری جمال پر بھی رعشہ سا طاری

ھونے لگتا ھے - لیکن زوبی پر ان طوفانوں کا کچھ بھی اثر نہیں ھوتا - یہ زبردست آندھیاں اس کے آنچل کو ذرا بھی نہیں ھلاتیں - وہ اپنے سوچ بورڈ کے سامنے بیٹھی رھتی ھے - اور اگرچہ یہ بھی ایک قانون خدا ھے کہ عورتوں پر نبوت کا نزول نہیں ھوتا - پھر بھی جب نمبر ۱۱۷ پر لگا ھوا چھوٹا سا برقی قمقہ ٹمٹانے لگتا ھے تو طور پر بجلی چمکتی ھے - زوبی موسیٰ کی طرح غش کھا کر گر نہیں جاتی بلکہ موسیقار آواز میں پوچھتی ھے، نمبر پلیز ؟

وہ نمبر بتاتا ھے -

زوبی نمبر دوھراتی ھے -

"شکریہ" - وہ کہتا ھے -

اور زوبی دل ھی دل میں سرشار ھو جاتی ھے -

مس پروین کو اس نمبر سے چڑ ھے، اور مس ڈی سوزا کو بھی - ان کا خیال ھے کہ اس ٹیلیفون سے مہندی سے رنگی ھوئی داڑھی اور دانت صاف کرنے والے خلال کی بو آیا کرتی ھے - اس ٹیلیفون کا مالک دن بھر گاؤ تکیہ کا سہارا لئے پان چباتا ھو گا - اس کے پہلو میں ایک یا دو یا شاید شرعی لحاظ سے چار بیگمات اتنا اپنا اگالدان سامنے رکھے بیٹھی ھونگی - دالان میں درجن بھر بچوں کی فوج کریہ‌ا بہ بخشائے بر حال ما کا ترانہ گاتی ھو گی - اور وہ ھر کروٹ پر شکریہ بسم اللہ مشاءاللہ کی مہارت کرتا ھو گا - - - - - - لیکن زوبی کے پردۂ خیال پر یہ نقوش کوئی نشان نہیں چھوڑتے رات کے

وقت جب وہ تار گھر کے عقب میں اپنے چھوٹے سے کوارٹر میں ایف - اے کے امتحان کی تیاری کرتی ہے۔ تو کبھی کبھی اس کا دماغ ٹیلیفوں کے تاروں کا سہارا پکڑ کر نمبر ۱۱۷ کی طرف رینگنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ طلسمی ہندسے اس پر طرح طرح کا سحر کرتے ہیں - کبھی وہ دب اکبر کی طرح جگماتے ہیں - کبھی ان پر کہکشاں کا نور برستا ہے۔ کبھی وہ تاریک ویرانیوں میں کھو جاتے ہیں - اور زوبی بھٹکتی جاتی ہے - گرتی جاتی ہے۔ ایک اندھے کوئیں میں - ایک عمیق غار میں - اور کوئی معزز فرشتہ اس کے دھانے پر وحی لے کر نازل نہیں ہوتا - کیونکہ عورتوں پر وحی کا نزول تقاضائے خداوندی کے خلاف ہے!

کچھ دنوں کی بات ہے کہ زوبی کے دل اور دماغ پر کچھ حیرانی، کچھ پریشانی کے مبہم سے سائے لرزنے لگے - نمبر ۱۱۷ کئی روز سے خاموش تھا - اس ٹیلیفون کے پردۂ ساز سے جو روح پرور نغمے پیدا ہوتے تھے، اُن پر سکوت طاری تھا - اور اس خاموشی کائنات کی ساری رنگینیاں صابن کے بلبلوں کی طرح مٹ رہی تھیں - رات کے وقت جب زوبی ایف - اے کے امتحان کی تیاری کرنے بیٹھی، تو ۱۱۷ کے سحر کار ہندسے بھوتوں کا روپ بھر بھر کر اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے - صبح سے شام تک وہ منتظر رہتی تھی کہ نہ جانے کس وقت سوچ بورڈ پر نمبر ۱۱۷ پر لگا ہوا ننھا سا قمقمہ روشن ہو کر ساری دنیا کو اپنے نور سے لبریز

کر دیگا - لیکن وہ تجلی چمکی پر نہ چمکی - زوبی سوچتی تھی، کہ شاید وہ چلا گیا ہو - شاید وہ بیمار - شاید - - - - آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کی خیریت پوچھے؟ اک چھوٹی سی ہمدردی کوئی گناہ بھی تو نہیں اگر مس پروین اور مس ڈی سوزا نے دیکھ لیا تو بے شک وہ بڑی بڑی باتیں بنائیں گی - اور مس پری جمال تو حسد سے جل بجھ ہی جائینگی - تعزیرات ہند والا آپریٹر بھی زیر لب مسکرائے گا - لیکن بلا سے - یہ بھی کوئی جرم ہے بھلا؟ اور آخر سوچ سوچ کر، ھچکچاتے ھچکچاتے، کانپ کانپ کر زوبی نے سب کی نظریں بچا کر نمبر ۱۱۷ کو ٹیلیفون کر ہی ڈالا پلگ لگا کر اس نے ریسیور اٹھایا اور دھڑکتے ہوئے دل سے گویا اپنی قسمت کا فیصلہ سننے لگی جو شاید ازل ہی سے لوح مقدس میں لکھا جا چکا تھا! ۱۱۷ نمبر ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی - جیسے نجد کے صحرا میں جرس ناقۂ لیلا - - - یا جیسے کسی نے شفوالرحیم کی زنجیر عدل کو ہلا دیا ہو اور ساتوں آسمان پر گھنٹیاں بج رہی ہوں - - -

"ہیلو" - ٹیلیفون نے کہا -

"جی، معاف کیجئے - میں ٹیلیفون آپریٹر بول رہی ہوں"۔ زوبی نے اقبال جرم کیا -

"کون آپریٹر؟" ٹیلیفون کچھ حیران سا ہوا -

"جی، زوبی - میرا مطلب ہے، زبیدہ رحیم بخش"۔ اس کی زبان لڑکھڑائی -

"ها ها ها"۔ ٹیلیفون میں ایک بلند قہقہہ صور اسرافیل کی طرح گونجا۔ "گرینڈ۔ گرینڈ۔ فرمائیے۔ فرمائیے"۔

زوبی کچھ حیران ہوئی۔ کچھ پریشان ہوئی۔ لیکن دل پر قابو پا کے اس نے کہنا شروع کیا۔ "جی، معاف فرمائیے۔ مجھے فکر ہوا۔ ۔ ۔ جی میرا مطلب ہے کہ آپ کا ٹیلیفون کئی روز سے خاموش تھا۔ میں نے سوچا کہ نصیب دشمناں کہیں آپ کی طبیعت خراب نہ ہو۔ جی، محض انسانی ہمدردی کے۔ ۔ ۔ ۔"

"ها ها ها" صور اسرافیل اور بھی زور سے گونجا۔ "میں سمجھا۔ تم شاید نصیر صاحب کے متعلق پوچھ رہی ہو۔ دیکھو مائی ڈیر، وہ تو یہاں سے تبدیل ہوچکا ہے۔ لیکن خدا کی قسم، میں اپنے دوست کی ساری ذمہ داریاں بعنوان شائستہ سنبھال سکتا ہوں۔ ها ها، زوبی ڈارلنگ، میں ٹھیک چھ بجے ایکسچینج کے باہر انتظار کرونگا۔ مائی گڈ نیس گریشس۔ وھاٹ اے لائف۔ وھاٹ اے ڈیم گلوریس لائف۔ ۔ ۔"

شام کے عین چھ بجے ایکسچینج کے دروازے پر ایک نیلے رنگ کی خوبصورت واسٹر بیوک آکے رکی۔ اور رحمت ایزدی نے زوبی پر اپنا نور کامل کردیا۔

سرود رفتہ

سہسرام کا شہر کئی لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک تو یہاں شیر شاہ سوری کا مقبرہ ہے۔ دوسرے یہاں آغا جانی کا بازار ہے۔ اور تیسرے اسی شہر میں ایک بار رانو کی موٹر کار کے دو ٹائر پنکچر ہو گئے تھے۔

جس طرح شیر شاہ سوری کی عظمت آغا جانی کے بازار کے پس منظر کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ اسی طرح رانو کی کار کے پنچکروں کے بغیر سہرام کا شہر بھی اپنی تاریخی اہمیت کھو بیٹھتا ہے۔ آغا جانی کے بازار کا قصہ یوں ہے، کسی زمانے میں اس مقام پر ایک قصبہ آباد تھا۔ یہاں کے سردار کا لقب آغا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی جسے لوگ جانی کہتے تھے۔ غالباً جانی اس کا نام نہ تھا۔ بلکہ اس لفظ کی دلفریب شان

محبوبیت سے قیاس ہوتا ہے، کہ وہ بے حد خوبصورت اور جمیل لڑکی تھی - جس پر بہت سے لوگ دل و جان سے فریفتہ تھے - ان میں سے ایک فرید خاں بھی تھا -

فرید خاں خواب دیکھنے کا شوقین تھا - خوبصورت خواب - بھیانک خواب - جنگ و جدال کے خواب - ہندوستان کی بادشاہت کے خواب - جانی کے خواب - جانی کی آنکھوں، جانی کے بالوں، جانی کی مسکراہٹوں کے دلفریب سپنے - اور جب اس کے خوابوں کی تعبیر نکلی، اور شیر شاہ نے ہندوستان کی بادشاہیت کا تاج پہنا، تو ایک تیز رفتار قاصد یہ پیغام لایا - کہ "جانی! میرا انتظار کرنا - میں بہت جلد اپنی ملکۂ عالم کے حضور میں آ رہا ہوں" - شیر شاہ بادشاہت کرتا رہا - اور جانی انتظار - انجام کار، شیر شاہ پر ایک سنگلاخ، تاریخی مقبرہ تعمیر ہوگیا - اور جانی کے نام پر جانی بازار کی بنیاد پڑ گئی - جہاں ہر روز اس شہید وفا کی یاد میں بیسیوں جانیاں بن سنور کر، سولہ سنگار کرکے سو سو کینڈل پاور کے برقی قمقموں کے عین نیچے کرسیاں سجا کر - - - خیر، یہ تو ایک دوسری کہانی ہے - یہاں پر قصہ تو رانو کی موٹر کار کا تھا - جسے پنکچر بھی ہونا تھا، تو سہسرام میں اب اگر وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اسے کون روک سکتا تھا؟ اگر وہ شیر شاہ کے مزار پر چلی جاتی، تو شاید وہاں پر سوئی ہوئی خاک کی چٹکی میں ایک لمحہ کے لئے آگ سی بھڑک اٹھتی - اور اگر وہ جانی کے بازار کی طرف جا نکلتی، تو - - - خیر، یہ بھی

حسن اتفاق تھا ۔ کہ وہ شیر شاہ کے مقبرے یا جانی کے بازار کی طرف جانے کی بجائے کچہریوں کی طرف چلی آئی ۔

اس وقت عدالت کے سامنے چوری کا کوئی معمولی سا مقدمہ زیر سماعت تھا ۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما بڑے جوش و خروش سے ایک گواہ پر جرح فرما رہے تھے ۔ وہ مقامی عدالتوں کے سب سے زیادہ سربراوردہ ، خرانٹ اور کہنہ مشق وکیل تھے۔ جب وہ گواہ سے کوئی مفید مطلب بات کہلوا لیتے تھے تو بصد ادب و احترام ، جھک کر چرب زبانی سے فرماتے تھے ۔ کہ ”عالی جناب ، عدالت اس فقرے کو نوٹ کرے“۔ لیکن ان کی ایک بھینگی آنکھ جو مدعی ، مدعاعلیہ ، گواہ اور مجسٹریٹ کو ایک ہی ترچھے زاویے سے دیکھنے کی عادی تھے ، پکار پکار کر کہتی تھی کہ ”ارے او مجسٹریٹ کے بچے ، اس فقرے کو یاد رکھنا !“ گواہ کی جرح پورے طور پر ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ عدالت نے اچانک مقدمے کی سماعت اگلی پیشی تک ملتوی کردی ۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما نے لاکھ کہا کہ ”حضور ، ابھی صفائی کے دو گواہ اور بھی موجود ہیں۔ جناب عالی ، وہ بڑی مشکل سے کلکتہ سے بلائے گئے ہیں ۔ سرکار والا وہ آج رات کی گاڑی سے واپس جانے پر مصر ہیں ۔ ۔ ۔“ ان کی بھینگی آنکھ نے بھی اپنی مخصوص زبان میں بہت سے الٹے سیدھے وار کئے ۔ لیکن عدالت کا فیصلہ اٹل تھا ۔ ابھی ابھی عدالت نے ملاحظہ فرمایا تھا کہ آج اس کی سر زمین پر سرخ حاشیے کے سینڈلوں والے دو خوبصورت اور نازک پاؤں

یوں محو خرام تھے جیسے کسی ستار پر دو حنائی انگلیاں مدھر مدھر سر میں درباری کا الاپ بجا رہی ہوں ۔ کچہری کے احاطے میں اچانک ایک مدھوش سی شمیم بس گئی تھی ۔ اور سفید جارجٹ پر بڑے بڑے گلابی پھولوں والی ایک ساڑھی نے ساری فضا کو گلنار کردیا ۔ چاروں طرف ایک سناٹا سا چھا گیا ، جیسے کمشنر صاحب بہادر اچانک کسی ہنگامی معائنے پر نمودار ہوگئے ہوں! عدالت کو ایک حسین مقدمے کے تخیل نے سرشار کردیا ۔ عبدالوہاب پیشکار کچھ عرصے کے لئے پان کی پیک نگلنا بھول گیا اور اس کے چند قطرے سامنے پڑی ہوئی تعزیرات ہند کی جلد پر ٹپک گئے ، جو اس نے نظر بچا کر اپنے کرتے کے دامن سے پونچھ ڈالے ۔ پنڈت کیسری ناتھ شرما نے بھی اپنی آنکھ کا زاویہ بدلا ۔ اور اس دھڑکتی ہوئی خاموشی میں ساری دنیا نے سنا کہ ایک موسیقار آواز کسی اردلی سے پوچھ رہی ہے ۔ ”کیا یہاں کسی کے پاس موٹر کار ہے؟“

یوں تو سہسرام کے مقدمہ بازوں ، وکیلوں ، مجسٹریٹوں ، کارکوں اور چپڑاسیوں کو اکثر یہ خیال آیا ہوگا کہ دنیا میں موٹر کار بھی ایک نعمت ہے ۔ لیکن اس وقت انہیں یہ احساس نہایت شدت سے ستانے لگا ۔ کہ موٹر کار کا نہ ہونا بھی ایک ناقابل عفو جرم اور ناقابل تلافی گناہ ہے ۔ اس جنس نایاب کے فقدان نے کچہری کے احاطے میں حیرانی اور پشیمانی کا ماحول سا پیدا کر دیا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ ایک زبردست احساس بے مائیگی سے آب آب ہونے لگا ۔ ”ہائے ، عجب

جنگلی شہر ہے یہ - ارے بھئی اگر موٹر نہیں تو پنکچر لگانے کا سامان تو ہوگا کسی کے پاس - ٹائر رینچ - جیک - ربڑ - سلیوشن وغیرہ وغیرہ" رانو بات تو اردلی سے کر رہی تھی لیکن ہر شخص محسوس کر رہا تھا، کہ وہ خاص اسی سے مخاطب ہے - اور ان کے پشیمان چہرے زبان حال سے یہ فریاد کر رہے تھے، کہ میری جان! یہ ایک موٹر ہی ہمارے بس کا روگ نہیں - ورنہ تم کہو تو ہم آسمان سے تارے نوچ لائیں - چاند اتار کر تمہارے پاؤں پر رکھدیں - کالی گھٹاؤں کو تمہارے گیسوؤں سے لڑا دیں - شیرشاہ سوری کا مقبرہ تمہاری ٹھوکر میں لا بچھائیں - جانی کا بازار تمہارے آگے پیچھے بسادیں - لیکن اے جان! یہ موٹرکار کا جوتا ہمارے منہ پر نہ مارو - ہم روسیاہ - - - -

رانو جلدی میں تھی، اس لئے وہ اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں بلبلاتے ہوئے، کسمساتے ہوئے فریادی چہروں کی آواز نہ سن سکی - اور نہ ہی اس نے حسرت و یاس، شرمندگی اور بے بسی کا وہ امتزاج دیکھا جو ایشر داس سائیکل ڈیلر کے منہ پر گرم گرم کول تار کی طرح تہہ بہ تہہ بچھا جا رہا تھا - وہ دن بھر درجنوں مقدمہ بازوں، منشیوں اور مختاروں کے سائیکلوں کے پنکچر درست کیا کرتا تھا - لیکن اے وائے! کہ زندگی عزیز کے اس انمول لمحے اس کا سارا کمال بے کار، بے سود، رائگان تھا - اگر خالی ربڑ کی بات ہوتی تو خیر وہ تو اپنی کھال تک کھینچ لیتا - لیکن

اس کے پاس نہ کوئی بڑا رینچ تھا ، اور نہ ھی جیک ۔ چنانچہ اب وہ اپنی ماڈرن سائیکل ورکشاپ کے سامنے ایک بے یار و مددگار اپاھج کی طرح کھڑا تھا جس کا مال و متاع اس کے سامنے لوٹا جا رھا ھو ، اور وہ ویران ھی رہ جائیں گے ۔ اب قسمت سے یہاں آ گئی ھو ، تو اپنا نور پھیلاتی جاؤ ۔ تمہارے نور میں تو کوئی کمی نہ ھو گی ، لیکن یہ زندگیاں غیر فانی ھو جائینگی ۔ یہ گھر آباد ھو جائیں گے ۔ آنے والی نسلیں تمہارے گیت بھی اسی شوق ، اسی سوز اسی حسرت سے گائیں گے جس طرح اب جانی کے قصے گائے جاتے ھیں ۔ ۔ ۔ ۔

کوئی ھوٹل کوئی ڈاک بنگلہ ؟ کوئی ریسٹ ھاؤس ؟ ھائے ، یہ بھی کیا مجبوری ھے اس نگوڑی کار کو بھی اسی جنگل میں پنکچر ھونا تھا ۔ پھر ایک بھی نہیں ۔ بیک وقت دو ٹائر پنکچر ھو گئے ھیں ۔ شاید ایک ٹیوب بالکل ھی پھٹ گئی ھو ۔ اب اس اجاڑ بیابان میں نئی ٹیوب کہاں ملے گی بھلا ؟ ھائے ، دن بھی ڈھلتا جا رھا ھے ۔ بنارس یہاں سے کوئی پچاس ساٹھ میل ھی تو ھو گا ۔ اگر یہ کم بخت کار پنکچر نہ ھوتی ، تو اب تک وھاں پہنچ بھی گئی ھوتی ۔ بنارس پہنچ کر اس نے ابھی کتنے کام کرنے تھے ۔ ایک بادشاہ کا مقبرہ ۔ ھماری آغوش میں آج بھی ایک جلیل القدر بادشاہ محو استراحت ھے ۔ لیکن یہ ناقد شناس لوگ پھر بھی ھمیں سہسرام ھی کہے جاتے ھیں ۔ جاھل ۔

پاگل ۔ احسان فراموش ۔ دیکھو تو سہی ، تمہاری کار کے پنکچر تک نہیں جوڑ سکتے ۔ گنوار ۔ نالائق ۔ نکمے ۔ ۔ ۔

"کیا یہاں پر رات گزارنے کے لئے کوئی اچھا ہوٹل ہے ؟"

ارے ہوٹل میری جان تجھے ہوٹل کی کیا حاجت ؟ یہ دل دیکھو ۔ یہ سینہ دیکھو ۔ یہ آنکھیں دیکھو ۔ یہ سارے پٹ تمہارے ہی لئے وا ہیں ۔ آؤ یہ کاشانے تمہارے ہی منتظر تھے ۔ اب تم کہاں جاؤگی ؟ یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں ۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"ہائے نہیں، میں کسی کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی ۔ کیا یہاں کوئی ڈاک بنگلہ بھی نہیں؟ کوئی ریسٹ ہاؤس؟"

سہسرام کچہری کے احاطے میں جتنے دل دھڑک رہے تھے، وہ سب اپنی اپنی جگہ ہوٹل یا ڈاک بنگلہ یا ریسٹ ہاؤس کا رتبہ حاصل کرنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگے ۔ اور ان کے کواڑ بے قراری سے بار بار کھلتے تھے، اور دامن پھیلا پھیلا کر فریاد کرتے تھے، کہ آؤ، گھڑی دو گھڑی کے لئے ان ویرانوں کو آباد کرتی جاؤ ۔ اگر یہ لاجواب ساعت بیت گئی، تو کون جانتا ہے کہ پھر دوبارہ واپس آئے نہ آئے اگر تم یونہی چلی گئیں، تو تاریک دھر انگلی تک نہ ہلا سکے۔

"خاک" رانو جھلاسی گئی۔ "کیا نام ہے اس شہر کا؟"

سہسرام کا ذرہ ذرہ پکارنے لگا، کہ ہمیں سہسرام کہتے ہیں پہلے ہمارا نام شہ سرام تھا ۔ بادشاہوں کے آرام فرمانے کی

جگہ ۔ وہ دیکھو، سامنے جو ایک سنگلاخ عمارت نظر آ رہی ہے ۔ وہ ایک مقبرہ ہے ۔

اس روز موٹر سائیکل کو بار بار اچانک دھکے لگتے تھے ۔ اصرافیل رہ رہ کے اپنا صور پھونکتا تھا ۔ جیسے پہاڑ ٹکرا گئے تھے ۔ زمین اور آسمان ایک دوسرے سے مل گئے تھے ۔ اور اس نفسا نفسی کے عالم میں رانو کے مرمریں بازو میری کائنات پر ایک مرغولہٗ نور کی طرح آویزاں ہو رہے تھے ۔ لیکن پھر وہ بگڑنے لگی ۔ غصیلی ناگنوں کی طرح بل کھاتی ہوئی تیوریاں اس کی پیشانی پر یوں تلملانے لگیں جیسے برفانی بادلوں کے آنچل میں بجلیاں تڑپ رہی ہوں ۔ جیسے مرمر کی سلوں پر چاندی کے تار سیماب کی طرح جھلملا رہے ہوں ۔ غصے میں بھی کیا کیف ہوتا ہے ۔ کیا نشہ ہوتا ہے ۔ کیسی رعنائی! چنانچہ اگر اس روز قدم قدم پر ٹھوکروں اور ھچکولوں نے ہمارا استقبال کیا تو اس میں نہ میرا قصور تھا اور نہ موٹر سائیکل کا نہ سڑک کا ۔ بلکہ ساری کائنات اس شہابی غبار کو دیکھنے کے لئے بیقرار تھی جو غصے کی تمازت میں رانو کے گالوں پر قوس قزح کی طرح چھا جاتا تھا — اور بخدا ! وہ کیا ہی لاجواب، لافانی، انمول لحمہ تھا جب اس کے ڈرائیور نے قطعی طور پر کہدیا کہ ”میم صاحب ۔ پنکچر لگانے کا سامان نہیں مل سکا ۔ جب تک یہ سامان نہ ملے، گاڑی بے کار ہے ۔“

رانو کی کار سڑک کے کنارے اس خاموش گائے کی طرح کھڑی تھی جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو ۔ اور بیس بیس کوس



تک کسی سلوتری کا ہسپتال ملنا محال ہو - ڈرائیور کا فیصلہ سن کر رانو کے گالوں کا شہابی غبار آتش فشاں پہاڑ کی طرح لاوے سے اگلنے لگا - اس کی آنکھوں میں جوالا مکھی کے شعلے سے بھڑکنے لگے - اور اس کے نازک پاؤں سہسرام کی اس خوش نصیب سرزمین کو غصے سے یوں پیٹنے لگے جیسے فرید خان ہندوستان کا تخت پانے کے خواب بن بن کر بے چینی سے ادھر سے اُدھر اُدھر سے ادھر پاؤں مارتا تھا - اور جیسے جانی انتظار کی گھڑیوں میں بے بس، پریشان، مہجور ایڑیاں رگڑتی تھی -- آج شام تک رانو کا کلکتہ پہنچنا کسقدر لازمی تھا - اس کا احساس نہ ڈرائیور کو تھا نہ موٹر کار کو جو ایک اپاھج گائے کی طرح سڑک کے کنارے دم توڑے پڑی تھی - حالانکہ یہ اشد ضروری تھا کہ وہ شام تک کلکتے ضرور پہنچ جائے - کیونکہ آج رات جشن آزادی کی رات تھی اور رات کے عین بارہ بجے جب آزادی کی دیوی آکاش سے اتر کر اس دھرتی پر آئے گی، اُس وقت گرینڈ ہوٹل کا بال روم اپنے پورے جوبن کے ساتھ اُس کا استقبال کریگا - یوں تو گرینڈ ہوٹل کا بال روم ہر شب شب‌برات مناتا ہے - لیکن آزادی کی رات بھی کوئی روز روز آتی ہے - اگر رانو نے یہ زریں موقعہ کھو دیا تو نہ جانے اُسے یہ جشن دوبارہ منانے کے لئے کتنے سو کتنے ہزار برس انتظار کرنا پڑے -- اور پھر ہربنس نے اُسے موقعہ پر خاص طور پر مدعو کیا تھا - ہربنس اس کا منگیتر تھا - بڑا البیلا، خوش باش، خوش دل جوان تھا - اور ناچتا بھی کیا خوب تھا - خصوصاً آج کی رات جب گرینڈ

ہوٹل کا آرکسٹرا نئی نئی سریلی دھنیں بجائیگا۔ جب بال روم کی فضا میں عطر اور لیونڈر، شمپین، قہقہے اور خوبصورت نازک اندام، سیمین اجسام ایک تیز و تند خمار کی طرح چھا جائینگے۔ جب رات کے بارہ بجے ہزاروں سال کے انتظار کے بعد آزادی کی دیوی وسکی۔ جن۔ شیری کے گلاسوں کی خوشنما جھنکار کے ساتھ زمین پر اتریگی۔ تو ہربنس کے رمبا میں کیا کیا ترنگ نہ ناچیگی۔ اس کے سبک قدم رقص گاہ کے شفاف اور لچکیلے فرش پر یوں پڑیں گے جیسے کسی جھیل کی لہروں میں کنول کے پھول تیرتے پھر رہے ہوں۔ اور اس کے گرسنہ، بے قرار بازو رانو کو ایک شعلۂ بے قرار کی طرح اپنی لپیٹ میں لئے ناچ گھر کے جمگھٹے میں یوں رقصاں ہوں گے جیسے دیا سلائی کو بھڑکتی ہوئی آگ میں چابکدستی سے تیز تیز گھمایا جائے اور اسے آگ نہ لگنے پائے — لیکن تقدیر کا نوشتہ کس نے مٹایا ہے اور کون مٹائے گا؟ عین اس وقت جب کلکتے میں ہربنس اپنے ڈنر سوٹ کے کالر میں لگانے کے لئے سفید گلاب کے ایک بڑے سے پھول میں پر لائن پیرس کا عطر "پیشن" سوئیوں سے چھو چھو کر بسا رہا تھا۔ رانو گرینڈ ٹرنک روڈ پر ایک خیراتی سرائے کی طرح بسے ہوئے چھوٹے سے شہر سہسرام میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے چھوٹے سے، تاریک سے بنگلے میں ایک ناقابل بیان، بیکسی بیزاری اور مایوسی کے عالم میں اپنا سامان اتروا رہی تھی۔ لیکن اس مہمان کی آمد پر صدیوں سے سویا ہوا بنگلہ انگڑائی سی لے کر بیدار ہوگیا۔ اس کی اونگھتی ہوئی بے جان دیواروں

میں زندگی کے آثار لہرانے لگے جمی ہوئی کھڑکیاں اور فرسودہ دریچے نو دمیدہ کلیوں کی طرح کھلنے لگے۔ تاریک چھتوں پر جیسے چاند اور تارے طلوع ہو گئے۔ اور جب رانو نے اپنے لاجواب ہاتھوں سے ڈرائنگ روم کی کرسیوں اور میزوں پر بکھری ہوئی کتابوں کو الماری میں رکھ کے صوفے کا رخ قدرے بدل کے رکھا تو اُس بھولے بسرے، پریشان حال کمرے میں نشاط اور شالامار کی گل پوش روشیں آراستہ ہو گئیں۔ اور پھر آج کی تاریخی رات کلکتہ نہ پہنچ سکنے کا غم غلط کرنے کے لئے رانو نے اپنے پکنک باکس سے جن، رم اور وسکی نکال کے چند تیز عنابی رنگ کے کاک ٹیل بنا کے نوش جان فرمائے۔ اُن کا خمار گلابی ڈوروں کی صورت میں اس کی غزالی آنکھوں میں چھلک آیا۔ اور اس کے گالوں پر آتشبازی کی مہتابیاں انار سے چھوٹنے لگے۔ آدھی رات کے قریب جب ہم شیر شاہ کے مقبرے کی چھت پر جا کے بیٹھ گئے تاکہ سہسرام کے گلی کوچوں میں آزادی کا نفوذ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ تو اُس وقت وہ ویران مقبرہ گرینڈ ہوٹل کے بال روم سے زیادہ منور اور با رونق محسوس ہونے لگا۔ اور اُس کے سناٹے میں ایک عجیب سماوی سا آرکسٹرا بجنے لگا۔ سہسرام کی سر زمین پر ایک نئے شیر شاہ نے جنم لیا جس پر تاریخ کبھی کوئی یادگار مزار تعمیر نہ کر سکے گی۔ اور ایک نئی جانی نے ظلمت شب کو اپنے گیسوئے عنبرین تابانی عطا فرمائی۔ لیکن اس کے نام پر غالباً کوئی بازار قائم نہیں ہوا۔ گھڑی کی سوئی بارہ بجنے سے کچھ

منٹ ادھر دھیمے دھیمے لرز رہی تھی، جیسے کسی حسینہ کے دھکتے ہوئے ہونٹ انکار اور اقرار کے مابین تھرتھرا رہے ہوں۔ شیر شاہ سوری کے مقبرہ کے گرد جو تالاب ہے اس کی سیڑھیوں پر بہت سے بچے خوشی اور جوش سے گلکاریاں مارتے ہوئے انار مہتابیاں، چھچھوندریں اور پٹاخے جمع کر رہے تھے۔ اور انہیں تالاب کے گرد اس خوبی اور کوشش سے سجا رہے تھے جس طرح رانو نے میرے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے پیچیدہ کاکلوں کو آراستہ کیا تھا۔ کلکتہ کے گرینڈ ہوٹل میں بال روم اپنے جوبن پر تھا۔ ہربنس رانو کی آمد سے مایوس ہوکر مس پریملا کو اپنی بانہوں کے حلقہ میں لئے آزادی کا رقص ناچ رہا تھا۔ ”ڈارلنگ“ مجھے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو۔ رانو اپنی مخمور، موسیقار آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”بائی گاڈ، میں اس مقدس رات کو آسانی سے برداشت نہیں کر سکتی۔ بائی گاڈ، میں وفور جذبات سے مر جاؤنگی“۔ آزادی کے انتظار میں رانو بھی ان بچوں کی طرح بے خود اور بیقرار ہو رہی تھی جو نیچے تالاب کی سیڑھیوں پر آتشبازی کی قطاریں سجا رہے تھے۔ اُف! ایک بچہ دھڑام سے پھسل کر سنگلاخ فرش پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ کا انار تڑاخ سے پھٹ گیا۔ اس کا چہرا گرم گرم دھوئیں کے غبار میں لپٹ گیا۔ اس کی آنکھیں جھلس کر مند گئیں اب وہ اپنی آنکھوں سے اس دیوی کی شان نزول نہ دیکھ سکیگا جس کا استقبال کرنے کے لئے اس نے اپنی توتلی زبان سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانا سیکھے

تھے - آسمان پر ایک تارا ٹوٹا - اور دور تک ایک خط نور کھینچتا ہوا غائب ہوگیا - جانی کے بازار میں طبلے پر زور کی تھاپ پڑی - گھنگرو ناچے - شیر شاہ کے مقبرے کے سنگلاخ پتھر سنگ مرمر بن گئے - چھت کے اندھیرے میں ایک شمع فروزاں بھڑکی - آزادی کی دیوی سوا نیزے پر اتر آئی تھی - اور میرے کانوں میں ایک نازک سی مترنم سی آواز کہہ رہی تھی، "چاکلیٹ سر؟"

میں نے آنکھ کھول کر دیکھا، تو ھلکے نیلے فراک والی ایئر ہوسٹیس بسکٹوں، چاکلیٹوں، چوسنے والی مٹھائیوں کی ٹرے لئے میری سیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے احمری بالوں کی ایک لٹ ٹرے پر بے پروائی سے لہرا رہی تھی - اور اس سے یاسمین کے سینٹ کی ھلکی ھلکی سی شمیم یوں آرھی تھی جیسے پھولوں کے کنج سے ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم کے جھونکے چھن رہے ہوں -

بی - او - اے - سی کا طیارہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اپنے چار انجنوں کی طاقت سے پوری رفتاری پر پرواز کر رہا تھا - راوی گزر چکی تھی - اور اس کے رومان بھی - اب ہم دریائے سندھ کے پاس پرواز کر رہے تھے، جس پر فقط سکھر براج ھی تعمیر ہو سکتے ھیں - اور گنگا اور جمنا، اور سون ھگلی کے مرغزار بہت پیچھے رہ گئے تھے - جہاں کے صنم خانوں میں رانو ازل تک راج کریگی - لیکن آزادی کی دیوی اب کبھی دھرتی پر نہ اتریگی - سہسرام کی سڑک پر کسی

کار کو پنکچر نہ ہونگے۔ شیر شاہ کا مقبرہ اب پھر آباد نہ ہو گا۔ اس سنگلاخ پتھر مرمر نہ بن سکیں گے۔ اس کی چھت پر کوئی شمع فروزان نہ بھڑکے گی۔ دگر دانائے راز آید کہ ناید!

— — —

ڈسپیچ

کانفرس

شملہ - ۲۵ جون سنہ ۱۹۴۵

دن کے گیارہ بجے ہیں - وائسریگل لاج کے باہر سڑک پر دو رویہ منتظر انسان قطار در قطار کھڑے ہیں - شملہ سطح سمندر سے ۷۰۰۰ فٹ بلندی پر واقع ہے - اس صحت افزا اور خوشگوار مقام پر ہندوستان کی سیاست کے بہت سے اہم باب لکھے گئے ہیں - آج بھی تاریخ ایک نازک کروٹ لینے پر آمادہ ہے - اخباری نمائندوں اور نامہ نگاروں کو اندر لان میں ایک طرف جمع کیا جا رہا ہے سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد تالیوں یا نعروں کی آواز گونجتی ہے - اس سے ہم

اندازہ لگاتے ہیں کہ لیڈر صاحبان تشریف لا رہے ہیں۔ وائسرائے کا پرائیویٹ سیکریٹری سر ایوان جنکنز ہر آنے والے کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہے۔ اور انہیں لان کے اس حصے میں لے جاتا ہے جس کے نزدیک اخباری نمائندوں کو جانے کی اجازت نہیں۔ وائسریگل لاج کے احاطے کے اندر اور باہر چاروں طرف مسلح پولیس اور فوج کا پہرہ ہے۔ سنگینوں رائفلوں اور مشین گنوں کے درمیان آزادی کی گفت و شنید کا تصور بڑا مہمل نظر آتا ہے۔ لیکن میں سگرٹ پی پی کر اپنی ذہنی الجھنوں کو چھپانے کی ہر کوشش کرتا ہوں۔ کیونکہ میری پریشانی اس ماحول میں بڑی ناگوار گزرے گی۔ ہندوستانی نامہ نگار بڑے جوش و خروش میں ہیں۔ لیکن انگریز اخباری نمائندے افسردہ نظر آ رہے ہیں۔ ان کے چہروں سے عیاں ہوتا ہے، کہ اگر وہ اس احساس فرض سے مجبور نہ ہوتے، تو اس منحوس موقعہ پر آنے سے ضرور گریز کرتے۔ میرے ساتھ صرف ایک اور امریکی نامہ نگار ہے۔ ہم اس گروہ میں اچھوتوں کی طرح الگ تھلگ کھڑے ہیں۔ ہم میں نہ ہندوستانی نامہ نگاروں ایسا جوش و خروش ہے نہ انگریز نامہ نگاروں ایسی افسردگی۔ میرا ساتھی میرے کان میں کہہ رہا ہے، کہ شملہ کانفرنس کی سچی خبریں صرف امریکی اخباروں ہی میں چھپ سکیں گی۔ کیونکہ ہمارے ڈسپیچ اس کانفرنس کی صحیح ترجمانی کرینگے۔ ہمیں نہ ہندوؤں اور مسلمانوں سے مخاصمت ہے نہ انگریزوں سے چڑ۔ ان تینوں میں سے جو بھی اس بر صغیر پر حکمرانی کرے، ہم اس کی خیر سگالی کے

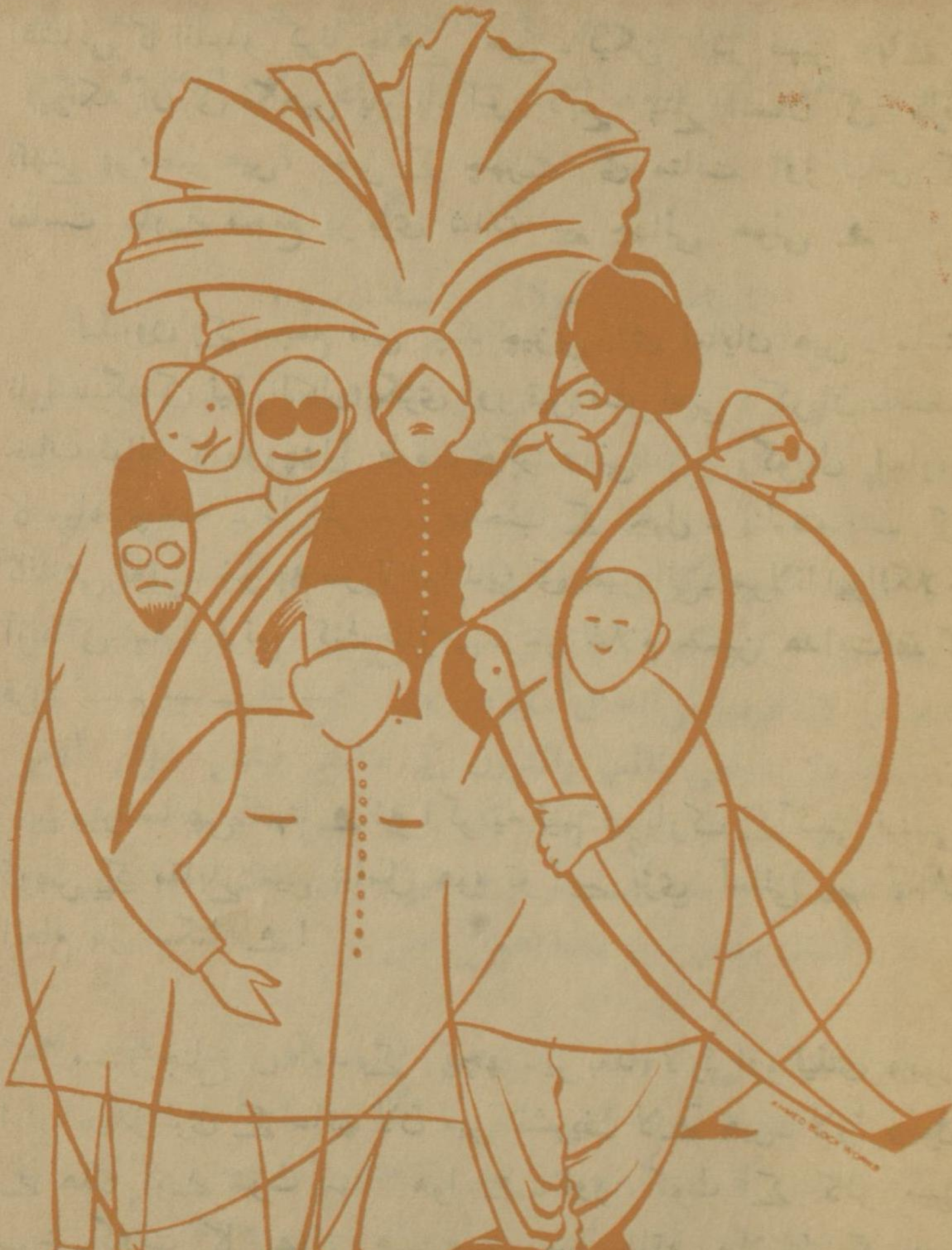
طلبگار ہیں ۔ امریکہ منڈیاں چاہتا ہے۔ ہم سیاسیات میں دخل دینا نہیں چاہتے ۔ لیکن ہمارا ڈالر۔ ۔ ۔ ۔ میرا ساتھی اپنی دھن میں امریکہ کی خارجی پالیسی پر تبصرہ کر رہا ہے۔ وہ آزادی، سیاست اور حکومت کو ڈالروں کی ترازو میں تول رہا ہے ۔ اور اس ماحول کی لافانی شعریت کو محسوس کرنے سے قاصر ہے، جو میرے رگ و پے پر شراب کے نشے کی طرح چھا جا رہی ہے۔ یہ آزادی یا غلامی یا ڈالروں پر بحث کرنے کا وقت نہیں۔ بلکہ ان عجیب و غریب لمحات کی روح کو جذب کرنے کا موقعہ ہے۔ جو گھڑی کی ہر ٹک ٹک کے ساتھ ہمارے گرد و پیش جنم لے رہے ہیں ۔ وائسریگل لاج کے باہر ہندوستان کے وسیع و عریض بر صغیر میں ٹڈیوں کی طرح چھپے ہوئے بھوکے ، ننگے ، لنگڑے، لولے انسان ۔ وائسریگل لاج کے اندر لان پر جمع ہوتے ہوئے لیڈر۔ اور ان کے درمیان وائسریگل لاج کی چار دیواری کے ساتھ سائے کی طرح لگے ہوئے مسلح سپاہی ۔ بندوقیں ۔ سنگینیں ۔ مشین گنیں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں اپنے ساتھی کے تبصرے کو خاموشی سے سن رہا ہوں ۔ میرے لئے نجات کا یہی ایک راستہ ہے۔ اگر میں اسے ٹوک دوں ۔ تو خوامخواہ بحث میں الجھنا پڑیگا ۔ اور میں اس وقت کسی قسم کی بحث میں الجھ کر اپنے احساسات کو پراگندہ کرنا نہیں چاہتا ۔

جب کوئی لیڈر وائسریگل لاج کے احاطے میں داخل ہوتا ہے ، تو سر ایون جنکنز بڑھ کر اسکا استقبال کرتا ہے۔ اور اسے

لان کے اس حصے کی طرف لے جاتا ہے جہاں اخباری نمائندوں کو جانے کی اجازت نہیں - کیمرے اٹھتے ہیں - اور آنے والے کی ہر زاویہ اور ہر پہلو سے بے شمار تصویریں لے لی جاتی ہیں - لیکن جب مسٹر محمد علی جناح آتے ہیں، تو بہت کم کیمروں کو جنبش ہوتی ہے - غیر ملکی نامہ نگاروں کو چھوڑ کر صرف تین مقامی نامہ نگار ان کی تصویریں لیتے ہیں - ان میں سے ایک پارسی ہے، اور دو مسلمان ہیں - باقی نامہ نگار جو ہندو ہیں، چپ چاپ اپنے کیمروں کو بند کر لیتے ہیں -

میرا ساتھی کہتا ہے - "میں نے سنا ہے کہ ہندوستان میں برہمنوں پر اگر اتفاق سے کسی مسلمان کا سایہ پڑ جائے، تو وہ ناپاک ہو جاتے ہیں - یہ نامہ نگار بھی شاید برہمن ہیں - مسٹر جناح کی تصویر لینے سے ان کے کیمرے ناپاک ہو جاتے یہ نہایت دلچسپ انکشاف ہے - میں آج ہی یہ کہانی اپنے اخبار کو بھیجونگا -"

ہر چند اپنے ساتھی کے ساتھ کسی بحث میں الجھنے سے گریز کرتا ہوں - پھر بھی اس کی اس بات پر مجھے بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے - لیکن یہ ہنسنے کا مقام نہیں - کیونکہ مسٹر جناح کے آتے ہی لیڈروں اور نامہ نگاروں پر دم بھر کے لئے خاموشی کا عالم چھا جاتا ہے - کچھ لوگ ہاتھ ملانے کے لئے ان کی طرف بڑھتے ہیں - کچھ لوگ ان کی آمد پر بے



اعتنائی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں - لیکن کر نہیں پاتے - کیونکہ ان کی نگاہیں بار بار اس دبلے پتلے انسان کی طرف اٹھنے پر مصر ہیں، جس کے چہرے کی متانت اور لباس کی نفاست سارے مجمع پر بڑی شدت سے چھائی ہوئی ہے۔

لیڈروں کے مجمع میں چند چیزیں بڑی نمایاں ہیں - ماسٹر تارا سنگھ کی نیلی اکالی پگڑی اور تین فٹ لمبی کرپان - خضر حیات ٹوانہ کا مورچھل طرہ - چکرا ورتی راج گوپال اچاریہ کا سیاہ چشمہ - ڈاکٹر خان صاحب کے چپل - پنڈت پنت کی گاندھی ٹوپی- خواجہ سر ناظم الدین کی شیروانی- مولانا ابوالکلام آزاد کی سفید فرنچ کٹ داڑھی - سر غلام حسین ہدایت اللہ کا فربہ جسم — — — —

میرا ساتھی کہتا ہے کہ اگر یہ ٹیم نیویارک کے کسی فینسی ڈریس کے مقابلے میں شامل ہو، تو اسے بڑی آسانی سے پہلا انعام مل سکتا ہے!

مسٹر جناح کی آمد کے کچھ دیر بعد لارڈ اور لیڈی ویول اپنے سیکریٹری کے ساتھ لان میں تشریف لاتے ہیں۔ لارڈ ویول نے ہلکا گرے سوٹ پہنا ہوا ہے۔ اور کوٹ کے کالر میں سرخ گلاب کا پھول ہے۔ سب سے ہاتھ ملانے کے بعد لیڈی ویول جرنلسٹوں کی دلجوئی کے لئے ہماری طرف رجوع فرماتی ہیں - اور لارڈ ویول لیڈروں کے ساتھ کانفرنس روم میں

چلے جاتے ہیں کانفرنس روم کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ دو مسلح سپاہی اس کے سامنے سنگینیں لے کر ایستادہ ہو جاتے ہیں۔

* * *

شملہ ۱۴ جولائی۔ سنہ ۱۹۴۵

کانفرنس ناکام رہی۔ ہندو اور مسلمان جرنلسٹ جو کئی دنوں سے خراماں خراماں وائسریگل لاج، آرمس ڈیل اور سیسل ہوٹل کا طواف کر رہے تھے، اب پژمردہ سے ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ کچھ انگریز نامہ نگار بڑے ہشاش بشاش نظر آ رہے ہیں۔ کیونکہ ایمپائر کی جڑ کاٹنے کے لئے جو کلہاڑا اٹھا تھا، اس کی ضرب فی الحال ملتوی ہو گئی ہے۔ میں اور میرا دوسرا امریکی ساتھی ٹائپ رائٹروں کے سامنے بیٹھے اپنے اپنے اخباروں کے لئے ڈسپیچ تیار کر رہے ہیں۔ چاروں طرف سے دھڑا دھڑ بیانات موصول ہو رہے ہیں۔ اس ملک میں بچے اور بیانات یکساں رفتار سے پیدا ہوتے ہیں۔

لارڈ ویول نے کہا۔ ”کانفرنس فیل ہو گئی ہے۔ اس کانفرنس کی تجویز میری اپنی تھی۔ اگر یہ کامیاب ہوتی، تو اس کی کامیابی کا سہرا میرے سر باندھا جاتا اب میں اس کی ناکامی کا ذمہ وار کسی اور کو ٹھہرانا نہیں چاہتا۔“

پنڈت جواہر لال نہرو نے بیان دیا۔ ”سیاست کو مذہب

کی آنکھ سے دیکھنا جمہوریت اور ماڈرن نظام اقتصادیات کا خون کرنا ہے۔ اگر ہم زمانہ جاھلیت کی اس روش پر گامزن رہے، تو معاشی اور سیاسی ترقی کی ساری منزلیں بہت دور رہ جائینگی۔ مسلم لیگ کی سیاست پر قرون وسطیٰ کے فرسودہ تخیلات چھائے ہوئے ہیں۔ اختلاف ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہیں۔ بلکہ یہ ترقی پسند اور رجعت پسند عناصر کی جنگ ہے۔"

ماسٹر تارا سنگھ نے فرمایا۔ "پاکستان کا معاملہ کانگرس اور مسلم لیگ کا مسئلہ ہی نہیں۔ بلکہ اس کا اصلی تعلق سکھوں سے ہے۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح وہ ہندوؤں کے زیر نگیں رہنے پر رضامند نہیں اسی طرح سکھ بھی مسلمانوں کی اکثریت کی دھونس ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں

ہندو مہاسبھا کے صدر ویر ساورکر نے بیان دیا۔ "کسی غیبی طاقت نے کانگرسیوں کا وہ ہاتھ روک دیا ہے جس سے وہ ہندو قوم اور مذہب کا گلا گھونٹنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔"

قادیانی جماعت کے امام مرزا بشیرالدین محمود احمد نے پیشن گوئی کی — "ویول کی پیش کش ایک خدائی نعمت ہے۔ اسے ٹھکرانا ہندوستان کے لئے بڑی بدنصیبی کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔"

مسٹر جناح نے کہا۔ ''لارڈ ویول کی تجاویز کا بغور تزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ یہ ہمارے لئے ایک جال بچھایا گیا تھا۔ ہندو کانگرس اور ہندوستان کی جغرافیائی یک جہتی کے تازہ ترین وکیل لارڈ ویول آپس میں گٹھ جوڑ کر کے کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا کہ ہم اپنے ہاتھوں اپنی موت کے پروانے پر دستخط کردیں ہمارا نصب العین پاکستان ہے۔ مسلمان ایک فرقہ نہیں، بلکہ ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور مسلم لیگ اس قوم کی ایک نمائندہ جماعت ہے جب تک ان واضح حقیقتوں کو تسلیم نہ کیا جائے، ہم کسی ہنگامی اور عبوری تجویز کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ لارڈ ویول کی تجاویز ان بنیادی حقائق کے منافی تھیں۔ انہیں منظور کرنا میرے نزدیک مسلمان قوم سے غداری کے مترادف تھا۔''

بیانات کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ میرے ہاتھوں میں ان سب کو ٹائپ کرنے کی سکت نہیں۔ یہاں اب رفتہ رفتہ شملہ کی زندگی اپنی اصلی سطح پر واپس آرہی ہے مال روڈ کی چند دکانوں پر جو کانگرس کے ترنگے جھنڈے لہرانے لگے تھے اب پھر اپنی الماریوں میں مقفل ہو گئے ہیں۔ مسز پشپا چرن داس نے کھدر کی ساڑھی چھوڑ کر فی الحال دوبارہ ریشم کا لباس اختیار کر لیا ہے۔ اور آج صبح سے وہ ''ڈیل'' میں مہاتما گاندھی کے درشن کی جگہ حسب معمول رائڈنگ پر جانے لگی ہے۔ سیسل ہوٹل میں میرے ہمسائے جناب

شیروانی صاحب بھی اب اپنا لائحہ عمل از سر نو مرتب کر رہے ہیں -

یہ جناب شیروانی صاحب بڑی خوبیوں کے مالک ہیں - پانچ فٹ دو انچ طول - پونے چار فٹ عرض، پیٹ کا قطر اس سے بھی زیادہ ٹانگیں چھوٹی سر بڑا جو گردن کی جگہ براہ راست کندھوں پر تربوز کی طرح اٹکا ہوا ہے آنکھیں اور کوٹ کے بٹنوں کی طرح بڑی بڑی اور گول گول جو باتیں کرتے وقت الفاظ کے زیر و بم کے ساتھ نیچے اوپر، دائیں بائیں برابر گھومتی رہتی ہیں جناب شیراونی صاحب سوٹ پہنتے ہیں اور مال روڈ پر مٹر گشتی کے وقت کیلے فورنیا کے امیر زادوں کے طرز کی سفید سٹراھیٹ بھی اوڑھا کرتے ہیں اس کے علاوہ اُن کے کمرے میں دو بڑے بڑے آھنی ٹرنک ہیں ایک میں کھدر کے کرتوں، سفید دھوتیوں چپلیوں اور گاندھی ٹوپیوں کا اسٹاک ہے۔ دوسرے میں شلواریں اور شیروانیاں ہیں آج صبح لارڈ ویول کے بیان کے بعد یہ دونوں صندوق بے کار ہو گئے ہیں اور ان کا ملازم انہیں ریلوے اسٹیشن پر لے جا کر واپس بک کرا دیتا ہے اب جناب شیروانی صاحب کے پاس فقط ان کا سفری وارڈ روب رہ جاتا ہے۔ جس میں پینتیس سوٹ، پچھتر نکٹائیاں ساٹھ قمیصیں اور درجن بھر ڈنر جیکٹ ہیں - مجھے ان تفصیلات سے کوئی دلچسپی نہیں - لیکن وائسرائے کے بیان کے بعد جناب شیروانی صاحب بیرونی ممالک کے اخباری نمائندوں کو اپنے کمرے میں کاک ٹیبل

پارٹی پر بلاتے ھیں ۔ اور وسکی، جن اور شیری کی آمیزش سے کوئی نصف درجن کاک ٹیبل پی کر اپنی موروثی جاگیر، وارڈ روب میں اپنے لباسوں کی تعداد اور اقسام سے لے کر اپنی دائمی قبض اور ھر صبح انیما کی ضرورت پر اس فصاحت سے روشنی ڈالتے ھیں کہ اسے فراموش کرنا کوئی آسان کام نہیں !

شملہ کی پہاڑیوں پر جس نئی صبح کا انتظار تھا ، وہ سحر طلوع نہیں ھوتی ۔ مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، جواھرلال نہرو، لیاقت علی خاں یکے بعد دیگرے رخصت ھو رھے ھیں ۔ ھندوستان کی سیاست کو ۷۰۰۰ فٹ کی بلندی راس نہیں آتی ۔ اس کا اصلی مقام ان وسیع و عرض میدانوں میں ھے جہاں اس وقت ۱۱۵ ڈگری فارن ھیٹ کا درجہ حرارت ھے ۔ اور خربوزے کے چھلکوں ، بسی ھوئی ترکاریوں اور بر سر عام سڑتے ھوئے بول وبراز پر بھنبھناتی ھوئی مکھیاں ھیضے کے جراثیم پیدا کرنے میں مصروف ھیں ۔

رات کے نو بجے آل انڈیا ریڈیو خبریں نشر کر رھا ھے کہ پرتاب گڑھ میں ھیضے سے گیارہ انسان ھلاک ھو گئے صوبہ بہار کے ایک گاؤں میں گائے ذبح کرنے پر فساد ھو گیا جس میں دو ھندو اور تیرہ مسلمان مارے گئے ۔ میرا ساتھی کہتا ھے کہ اس ملک میں جب وبا پھوٹتی ھے تو انسان مرتے ھیں ۔ اور جب فساد ھوتا ھے ھندو یا مسلمان ھلاک ھوتے ھیں ۔ اور اس انکشاف پر بے حد مسرور ھے ۔ اور اپنے اخبار کے لئے ایک دلچسپ سٹوری تیار کر رھا ھے ۔

ڈسپیچ ۲

جب رابرٹ لانگ بمبئی کے کسٹم ہاؤس سے باہر نکلا ، تو ٹیکسی ڈرائیوروں کا ایک غول بیابانی اس پر جھپٹا - لیکن وہ اچک کر سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک خالی وکٹوریہ میں سوار ہو گیا - وکٹوریہ کی چھت اتری ہوئی تھی ، اور گھوڑا اور کوچبان دونو مزے مزے کے خراٹے لے رہے تھے - گھوڑے کے سر — پر ایک کوا بیٹھا اس کے دونوں کانوں میں باری باری سے ٹھونگیں مار رہا تھا - مکھیوں کا ایک چھتہ کوچبان کے منہ پر منڈلا رہا تھا - کچھ مکھیاں اس کے نتھنوں اور نیم وا دھانے میں بے تکلفی سے مصروف سیاحت تھیں - رابرٹ لانگ کے سوار ہونے پر گاڑی کو دھکا لگا ، اور گھوڑا اور گھوڑے کا مالک دونوں اپنے خوابوں کے جزیروں سے اس دنیائے فانی میں لوٹ

آئے - کوچبان نے اپنی بھینگی آنکھیں گھما کر مسافر کا جائزہ لیا - اپنے منحنی جسم کو موڑ توڑ کر ایک پیچیدہ سی انگڑائی لی - اور زور سے کھنکار کر دو تین ادھ موئی مکھیوں کو باھر تھوک دیا - جو سیر و سیاحت کے شوق میں اس کے گلے کے اندرونی نہاں خانوں میں جا بھٹکی تھیں - پھر اس نے چابک ھوا میں گھما کر دو چار گھوڑے کی پیٹھ پر رسید کئے - گھوڑے نے احتجاجاً اپنی پچھلی ٹانگیں اٹھا کر کچھ دولتیاں جھاڑیں اور پھر خاموشی سے راہ راست پر چل پڑا -

چوں چوں—ٹھک ٹھک—چوں چوں ٹھگ ٹھگ——

وکٹوریہ چر چراتی ھوئی کھٹکھٹاتی ھوئی چلی جا رھی تھی - اس کے آگے پیچھے ، دائیں بائیں موٹروں ، ٹراموں ، تانگوں ، رکشاؤں ، سائیکلوں ، کتوں ، بکریوں ، بیلوں اور انسانوں کا تانتا سا بندھا ھوا تھا - اگر کوئی چیز اچانک وکٹوریہ کے راستے میں حائل ھوتی تھی - تو کوچبان بڑی فصاحت و بلاغت سے اس کے شجرۂ نسب پر طویل تبصرہ کرتا تھا - اس کے منہ میں پان کی پیک بھری ھوئی تھی اور وہ بڑی بے تکلفی سے اسے راہ چلتے ھوئے انسانوں اور جانوروں پر تھوکتا جاتا تھا - رابرٹ لانگ وکٹوریہ کی سیٹ پر نیم دراز پڑا سوچ رھا تھا - کہ کوچبان نے ابھی تک اس سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاھتا ھے - نہ معلوم وہ اسے خراماں خراماں کس منزل کی طرف لئے جا رھا ھے ؟ شاید اس یوگیوں اور جادوگروں کی سر زمین پر جہاں لوگ ننگے پاؤں دھکتے ھوئے انگاروں پر چلتے ھیں ، شیشے چباتے ھیں - رسوں پر درختوں کی طرح چڑھ جاتے ھیں ،

سوئیوں اور میخوں پر سوتے ہیں—شاید کہ اس سر زمین کے کوچبان اپنے مسافروں کی پیشانی پر ہی ان کی منزل کا نام پڑھ لیتے ہوں؟ شاید یہ کوچبان کوئی پر اسرار یوگی ہو جو مستقبل کے آئینے میں نا معلوم قسمتوں کے راز پڑھتا ہو۔ شاید اس نے دیکھا ہو کہ نیو یارک پوسٹ کا نامہ نگار خصوصی رابرٹ لانگ کوین ایلزبتھ میں امریکہ سے لندن پہنچا۔ لندن میں اس نے اپنے اخبار کے لئے کہانیاں لکھیں، شراب پی اور ھائیڈ پارک میں منڈلانے والی بے شمار چھوکریوں سے معاشقے کئے۔ ایس، ایس، سیڑتھ مور میں اس نے پہلے مسز جیکسن اور پھر ھلڈا سے جی بہلایا—اور آج صبح جب جہاز نے اپنے مسافروں کو بمبئی کی زمین پر اگل دیا تو یہ پراسرار کوچبان اپنے جانے پہنچانے دوست کو لینے کے لئے پہلے ھی سے سڑک پر موجود تھا! شاید اب وہ اسے اپنے پوشیدہ تہ خانے کی طرف لئے جارہا ہے جس میں عود اور عنبر کی بتیاں سلگ رہی ہوں گی۔ دیواروں پر کھوپڑیوں اور ھڈیوں کے ڈھانچے لٹک رہے ہوں گے۔ ایک کونے میں ایک مدھم سی موم بتی جل رہی ہوگی۔ دوسرے میں کوچبان ہوگا۔ اپنے ھاتھ میں الہ دین کا چراغ لئے۔۔۔۔۔۔ یکایک رابرٹ لانگ کا سہانا سپنا ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ کیونکہ وکٹوریہ کا ایک پہیہ سامنے کی طرف سے آتی ہوئی بیل گاڑی کے پہئے سے ٹکرا کر بری طرح الجھ گیا تھا۔ بیل کی گردن کھنچ کر وکٹوریہ کے اندر آگئی تھی اور سرخ سرخ جلتی ہوئی آنکھوں والا بیل وکٹوریہ کے اندر رابرٹ لانگ کے عین سامنے بڑے خطرناک انداز میں پھنکار

رہا تھا ۔ اس کے نوکیلے سینگ رابرٹ لانگ کی چھاتی سے چند انچ دور مہیبانہ طور پر آویزاں تھے اور منہ سے کف اُبل اُبل کر اس کی پتلون پر ٹپک رہی تھی ۔ کوچبان اور گاڑیبان اپنی اپنی جگہ بیٹھے زور زور سے چلا رہے تھے اور ایک دوسرے کے خاندان کی مستورات کے چال چلن کے متعلق بڑے گہرے رازوں کے انکشافات کررہے تھے ۔ تماشبینوں کا ایک گروہ نیم بیضوی شکل میں کھڑا اپنی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا ۔ کبھی کبھی گاڑیبان کے ہاتھ کو اپنی طرف اشارہ کرتے دیکھ کر رابرٹ لانگ کو خیال ہوتا تھا ۔ کہ شاید اس کا اپنا شجرۂ نسب بھی زیر بحث ہے ۔ جتنے منہ اتنی باتیں ۔ ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق صورت حالات پر تبصرہ کر رہا تھا ۔ ایک دھوتی پوش بزرگ نے جو سر پر گاندھی ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے ۔ یہ حل پیش کیا کہ کوچبان اپنے سفید فام مسافر کو وکٹوریہ سے نیچے اُتار دے، سلیمان نے سختی سے یہ تجویز ماننے سے انکار کردیا ۔ کیونکہ اس عمل سے وکٹوریہ کے پہیے کا بیل گاڑی کے پہیے سے الگ ہونے کا کوئی عملی پہلو نہیں نکلتا تھا ۔ اس انکار پر گاندھی ٹوپی والے بزرگ نے سلیمان کی سرخ ترکی ٹوپی کے متعلق ایک گھناؤنی سی رائے کا اظہار کیا ۔ سلیمان نے بھی ترکی بترکی جواب دیا اور گاندھی ٹوپی کے متعلق عورت کے جسم کے بعض حصوں کی ساخت کی تشبیہہ پیش کی ۔ سامعین میں کچھ لوگوں نے داد دی ۔ بعض لوگ مسکرائے ارر بعض بری طرح بگڑے ۔ رابرٹ لانگ کو اس بحث میں بڑا مزا آرہا تھا ۔

اس کے دل میں ایک مبہم سی امید نے کروٹ کی کہ شاید اس ملک کی روایات کے مطابق ٹوپیوں کی یہ تکرار بڑھتے بڑھتے ہندو مسلم فساد کی شکل اختیار کرے — اور وکٹوریہ میں ایک بپھرے ہوئے بیل کے سینگوں کے سامنے بیٹھے بیٹھے اس کا صحافتی دماغ نیویارک پوسٹ کے لئے ایک تاریخی ڈسپیچ تیار کرنے لگا — ”بمبئی میں ہندو مسلم فساد۔ تین سو افراد ہلاک، بے شمار زخمی۔ امریکی اخبار نویس کی گھوڑا گاڑی پر بحث — نیویارک پوسٹ کے نمائندہ خصوصی رابرٹ لانگ پر حملہ —“

بد قسمتی سے رابرٹ لانگ کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ جب گاڑی بان اور کوچبان کے پاس ایک دوسرے کے خاندانی اسرار و رموز ختم ہوگئے تو انہوں نے خاموشی سے اتر کر اپنی گاڑیوں کے الجھے ہوئے پہیوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور چند الوداعی گالیوں کے بعد اپنی اپنی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔

وکٹوریہ میں بیل کے سینگوں کے سامنے اکڑوں بیٹھے بیٹھے رابرٹ لانگ کی کمر اور پیٹھ تھک گئی تھی اور اس کا جی چاھتا تھا کہ وہ جلد از جلد تاج محل ہوٹل پہنچ کر گرم گرم غسل کرے اور پھر لاؤنج میں بیٹھ کر ان غزالی آنکھوں، سانپ کی طرح لہرانے والی کالی چوٹیوں اور سرسراتی ہوئی دلفریب ساڑھیوں کا نظارہ کرے۔ جن کے تخیل نے مدت سے اس کے دل کو آباد کیا ہوا تھا یہ تصویریں الف لیلہ کے قصوں کی طرح اس کے دماغ پر نقش تھیں اور بے شمار عجیب و

غریب روحانی تصورات نے اس پر ایک طلسمی جال سا بن رکھا تھا۔ رابرٹ لانگ نے سوچا کہ بیل کے ساتھ اس کا پہلا تجربہ کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا اور اس کی پتلون پر کف کے گرے ہوئے چھینٹے بڑے غلیظ نظرآرہے تھے۔ اگر وکٹوریہ کا پر اسرار یوگی سلیمان اسے یونہی اپنی طلسماتی دنیا میں لئے پھرتا رہا، تو نہ معلوم ابھی کتنے اور بیلوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کے ساتھ اسے اختلاط کا شرف نصیب ہوگا یوں تو وہ ایک سچے نامہ نگار کی طرح ہرقسم کے تجربات کیلئے تیار تھا۔ لیکن بمبئی کی پہلی شام! اگر یہ شام غزالی آنکھوں اور بل کھاتی ہوئی ناگنوں کے بغیر گزر گئی تو زندگی میں ایک ایسا خلا رہ جائے گا جسے دوسری ہزاروں خوشگوار اور پر کیف شامیں بھی پر نہ کر سکیں گی۔ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ یہ چند اولیں تاثرات ہی تو ہوتے ہیں جن میں کچھ اجنبیت، مغائرت، کچھ قرب، کچھ بعد کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ حجلۂ عروسی کی پہلی شام! ڈوبتے ہوئےسورج کی آخری کرنیں بمبئی پر اداسی کی طرح چھائی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں دکانوں کے اندرونی حصوں میں بجلیاں بھی جلنے لگی تھیں۔ یہی تو وہ اچھوتا وقت تھا۔ جب روشنی اور تاریکی گلے ملتی ہیں۔ آئینوں کے سامنے مرمریں اجسام پر کالی زلفوں کے بادل بکھر جاتے ہیں کائنات کروٹ لیتی ہے۔ گناہ اور ثواب پہلو بدلتے ہیں— تاج محل ہوٹل کے بال روم میں قمقموں کی دیپ مالا روشن ہوتی ہے اور غزالی آنکھیں کالی کالی، لہراتی ہوئی ناگن زلفیں—

''تاج محل ہوٹل''۔ رابرٹ لانگ نے ذرا چلا کر سلیمان

کو مخاطب کیا۔ وہ اپنے مستقبل کی عنان اس مشتبہ یوگی کے ہاتھ میں دے کر بمبئی میں اپنے پہلے دن کے تجربات کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"بہت اچھا صاحب" سلیمان نے اس کی طرف دیکھے بغیر میکانکی طور پر جواب دیا۔

کچھ دور آگے پان اور بیڑی کی دوکان تھی۔ وکٹوریہ اس کے سامنے رک گئی نیچے اتر کر سلیمان نے کچھ پان اور بیڑیاں خرید کیں۔ داموں پر اس کی دکاندار کے ساتھ کچھ تکرار بھی ہوئی۔ وہ دونوں ابھی بازار کے بھاؤ پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہ ایک بندر والا وکٹوریہ کے قریب آیا اور ہاتھ بڑھا کر اس نے رابرٹ لانگ کے کانوں کے نزدیک زور سے ڈگڈگی بجائی۔ رابرٹ لانگ گھبرا کر چونک اٹھا۔ بندر والے نے بہت سے رنگوں کا ڈھیلا ڈھالا چغہ پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ایک لمبوتڑی ٹوپی تھی جس میں جا بجا مور کے پر اڑسے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں رسی تھی جو دو بڑے بندروں کے گلے میں پڑی ہوئی تھی اور کوئی چار پانچ چھوٹے چھوٹے بندر کے بچے اس کے جسم پر جا بجا چمٹے ہوئے تھے۔ کوئی کندھے پر بیٹھا تھا۔ کوئی گردن پر۔ کوئی پیٹھ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اور ایک ننھا منا سا بچہ اس کی ٹوپی پر فراغت سے بیٹھا مونگ پھلی ٹھونگ رہا تھا۔ ڈگڈگی کی آواز سن کر ٹوپی والا بندر نیچے اتر آیا اور چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا لپک کر رابرٹ لانگ کے زانوؤں پر آ بیٹھا۔ اس کے منہ میں مونگ پھلی کا دانہ تھا اور وہ رابرٹ لانگ کا منہ چڑا چڑا کر اسے کترنے لگا۔ رابرٹ کو

یہ ادا بہت پسند آئی اور اس نے پیار سے بندر کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"ڈگ ڈگ، ڈگ ڈگ"۔ بندر والا بڑا کائیاں تھا۔ زور زور سے ڈگڈگی بجا کر اس نے قیمت کا اعلان کیا۔ "صاحب بڑا نسلی بندر ہے۔ صرف ایک سو روپیہ"۔

اتنے میں سلیمان بھی پان اور بیڑی کا سودا چکا کر واپس آ گیا تھا۔ سو روپیہ سن کر اس کے کان کھڑے ہوئے۔ "ارے سو روپے کے بچے۔ ڈاکہ ڈالنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"اجی میاں، اپنا راستہ ناپو۔ تم کیوں ہماری بات میں ٹانگ اڑاتے ہو"۔

"اچھا جی، یہ بات ہے؟ میں کہتا ہوں بیٹا۔ میرے ساتھ معاملہ کرلو۔ ابھی بکوادوں گا۔ ہاں ایسے صاحبوں کو انگلیوں پر نچانا تو روز کا کام ہے اپنا۔ کیا کہتے ہو؟"

"بولو۔ کیا دلواتے ہو۔"

"تیس! بیس تمہارے، دس اپنے۔ کیا کہتے ہو؟"

"کچھ اور دلواؤ استاد۔ تمہارے قدموں کے طفیل ہمارا بھی بھلا ہوگا۔" بندر والا خوشامد کرنے لگا۔

"اچھا دیکھتا ہوں۔ تم بھی کیا یاد کروگے بیٹا۔"

بندر والے اور سلیمان میں کافی دیر تک چیخ چیخ ہوتی رہی۔ وہ پانچ اترتا تھا یہ دو بڑھتا تھا اور انجام کار سودا پچاس پر آ کے رکا۔ رابرٹ لانگ نے ڈالروں کا حساب لگایا، تو پندرہ یا سولہ ڈالر بنتے تھے۔ یعنی نیو یارک کے ہوٹل میں دو اچھے لنچوں کی قیمت۔ یا پیرس میں کسی نائٹ کلب کی



ایک رات ۔ اس قیمت پر یہ ننھا منا بندر مہنگا نہیں تھا جو اس کی گود سے نکل کر اب اس کے کندھے پر بیٹھا بڑے مزے سے مونگ پھلی کھا رہا تھا ۔ نظر بچا کر سلیمان نے بیس روپے اپنی جیب میں ڈال لئے اور تیس بندر والے کے سپرد کئے۔ رابرٹ لانگ دل ہی دل میں سلیمان کی مدد پر احسان مند ہوا جس نے کمال محنت سے بندر کی قیمت سو روپے سے پچاس کروائی تھی۔ جب وکٹوریہ دوبارہ چلی تو گھوڑے کی چال میں پہلے سے زیادہ سبکی تھی اور سلیمان کا چابک بھی غیر معمولی سر گرمی سے کام کر رہا تھا ۔ اس نے اپنے منہ میں بھری ہوئی پیک کو ایک راہ چلتی ہوئی گائے کی پیٹھ پر پچکاری مار کر تھوک دیا ۔ ٹوپی اتار کر اس کی گرد کو جھاڑا۔ پھندنے کو سلجھایا ۔ کانوں میں رومال گھما کر میل نکالی اور پھر گردن گھما کر اپنی بھینگی آنکھ کے ترچھے زاویے سے رابرٹ کی طرف دیکھا ۔ " ھلا گلا صاحب؟" اس نے راز دارانہ انداز سے دریافت کیا ۔

" ھلا گلا؟" رابرٹ لانگ نے سوچا شاید یہ کسی ہندوستانی مٹھائی کا نام ہو ۔ یا شاید یہ اس پر اسرار یوگی کے کسی خفیہ تہ خانے کی طرف اشارہ ہو ۔ بہر کیف وہ اپنے محسن کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا ۔ اگر سلیمان کی مرضی ھے کہ وہ اپنے مسافر کو وکٹوریہ میں زیادہ سے زیادہ عرصہ بٹھا کر کرایہ میں خاطر خواہ اضافہ کرسکے تو کرنے دو ۔ یہ اس کا حق ھے ۔ آخر اس نے بھی تو کوشش کرکے بندر کی قیمت میں پچاس روپیہ کی تخفیف کروائی تھی ۔ تاج محل ہوٹل کیا ھے ۔ ایک گھنٹہ پہلے پہنچے یا بعد ۔ فرق ہی کیا پڑتا ھے ۔ ھاں، استاد

سلیمان ! اگر تمہاری خوشی ھلا گلا ھی میں ھے تو ھلا گلا ھی سہی - یہ کسی ھندوستانی مٹھائی کا نام ھو یا کسی یوگی کے پر اسرار تہ خانے کا - ایک ھی بات ھے - تم اپنا جی خوش کرلو!

"آپ کا دل بہت خوش ھوجائے گا۔ صاحب اس کے بغیر بمبئی میں جینا بھی بیکار ھے اور مرنا بھی بیکار ھے"- سلیمان نے اپنا فلسفہ بیان کیا پھر اس نے ایک بجلی کے کھمبے کے نیچے رک کر گاڑی کے دھواں آلود ، میلے، لمپوں کو روشن کیا - شام کا دھندلکا اب تاریکی میں بدل گیا تھا۔ اور گنجان بازاروں کی ریل پیل سے نکل کر وکٹوریہ ایک خاموش سڑک پر چلی جارھی تھی- دونوں طرف کشادہ باغیچوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں تھیں- اگر ان میں روشنیاں نہ ھوتیں اور کہیں کہیں برآمدوں سے ھنسنے یا بولنے کی آوازیں نہ آتیں تو شاید یہ محسوس ھوتا کہ یہ آبادی نہیں ، قبرستان ھے - کوئی آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد وکٹوریہ سیمنٹ کے ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رک گئی - پھاٹک پر ایک چوکیدار بیٹھا چلم پی رھا تھا - سلیمان کو دیکھ کر اس نے سلام کیا اور رابرٹ لانگ ایک سحر زدہ انسان کی طرح اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا آیا -

ڈرائنگ روم میں اور کوئی نہ تھا - فرش پر ایک پرانا قالین بچھا ھوا تھا جس کا بر پامال ھوکر جگہ جگہ سے اڑ گیا تھا اور اب اس کی صورت ٹاٹ ایسی نکل آئی تھی - صوفوں کے سپرنگ بیٹھے ھوئے تھے اور گدوں پر کہیں تیل ، کہیں سیاھی ، کہیں سالن کے چکنے دھبے تھے - دروازوں پر موٹے

موٹے پردے لٹک رہے تھے ۔ جن کا رنگ شاید کبھی سرخ تھا ۔ لیکن اب مرغی ذبح کرنے کے بعد نالی میں جمے ہوئے خون کی طرح سیاہی مائل ہوگیا تھا ۔ چھت پر مکڑی کے جالے نہ معلوم کس کس بھید کی پردہ پوشی کر رہے تھے ۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ کر گر گیا تھا اور کہیں کہیں پکے ہوئے پھوڑے کی جلد کی طرح پھٹنے کے قریب تھا ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دیواروں کی چھاتی سالہا سال کے راز چھپائے تھک گئی ہے اور اب کسی وقت مجبور ہو کر اچانک بھک سے پھٹ جائے گی فضا میں ایک عجیب سی کثافت تھی اور کمرے کے ایک کونے میں ایک طوطے کا پنجرا لٹک رہا تھا ۔ طوطے نے رابرٹ لانگ کی آمد پر تو کوئی توجہ نہ دی ۔ البتہ اس کے کندھے پر بیٹھے ہوئے بندر کو نیم باز آنکھوں سے بری طرح گھورا ۔ بندر نے بھی جوابی کارروائی شروع کی اور کچھ عرصہ تک وہ دونوں ایک دوسرے کو گھور گھور کر اپنی شدید ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہے ۔ قریب تھا کہ ان کا اختلاف رائے کوئی اور عملی صورت اختیار کرے کہ یکا یک ایک پردے کو جنبش ہوئی اور ایک ادھیڑ عمر کی کالی کلوٹی، موٹی سی عورت یوں کمرے میں داخل ہوئی جیسے ریل کا انجن بھک بھک کرتا پلیٹ فارم پر آتا ہے ۔

”خوش آمدید خوش آمدید ۔ میرے اچھے نوجوان یہ تمہاری نیک بختی ہے کہ تم یہاں چلے آئے ۔ ورنہ اجنبی نوجوان اس غلیظ شہر میں بری طرح بھٹک جاتے ہیں ۔ اور پھر پشت ہا پشت تک ان کے خون میں پاکیزگی پیدا نہیں ہوتی ۔ سلیمان بڑا اچھا رہنما ہے ۔

میری چھت کے نیچے ابھی تک کوئی جراثیم پیدا نہیں ہوئے۔ یہاں پر تم اپنے آپ کو یوں محفوظ سمجھو جیسے تم ڈی، ڈی، ٹی کے ڈب میں بیٹھے ہو۔ آؤ، آؤ، جواں۔ آؤ"۔ بھک بھک کرتا ہوا انجن روانہ ہوا اور رابرٹ لانگ ریل کے ڈبے کی طرح اس کے ساتھ جتا ہوا پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ عورت کے بال کٹے ہوئے تھے اور ان میں جا بجا میل کے سفید سفید ذرے ابرک کی طرح چمک رہے تھے۔ اس نے نیلی چھینٹ کا فراک پہنا ہوا تھا جس کے نیچے اس کی برھنہ پنڈلیاں آبنوسی مگدروں کی طرح نکلی ہوئی تھیں۔ پاؤں میں اونچی ایڑی والی گرگابی تھی جس پر مدت سے پالش نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی چند قدم ھی چلے تھے کہ یکایک عورت کے منہ سے ایک ڈراؤنی چیخ نکلی اور وہ اچھل کر دھڑام سے فرش پر گر گئی، جیسے ریل کا انجن پٹڑی سے اتر کر الٹ جائے۔ رابرٹ لانگ نے جلدی جلدی اس کا فراک درست کیا، اور اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر اسے اٹھایا۔

"معاف کیجئے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرے اس بیوقوف بندر نے خواہ مخواہ آپ کے کندھے پر کود کر آپ کو ڈرا دیا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"اوھو، یہ تمہارا بندر ھے! آھا، کیسا پیارا بچہ ھے۔ میں تو خواہ مخواہ ڈر گئی۔ کتنا سویٹ ھے یہ۔"، عورت نے اپنے سہمے ہوئے چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے منہ پر پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے جن میں پاؤڈر گھل گھل کر برص کے داغوں کی

طرح پھیل رہا تھا ۔ اس کے بالائی ہونٹ پر بالوں کی لکیر جو کریم اور پاؤڈر کی تہوں میں دبی ہوئی تھی ، اب گھبرائی بلی کے رونگٹوں کی طرح کھڑی ہو گئی تھی ۔

ڈرائینگ روم سے نکل کر وہ ایک دالان میں آئے ۔ وہاں سے وہ مکان کے پچھواڑے میں ایک اور کمرے میں داخل ہوئے ۔ یہ کمرہ بڑا خوش نما تھا ۔ چھت پر کئی سو کنیڈل پاور کے قمقمے نور برسا رہے تھے ۔ دیواروں پر پھولدان اور گلدستے لٹکے ہوئے تھے ۔ فرش پر ایک بے داغ سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی ۔ ایک کونے میں خوبصورت ایرانی غالیچہ تھا ۔ اس پر ریشم کے گاؤ تکیئے لگے ہوئے تھے ۔ اور ایک تکیئے کے سہارے نجمہ ایک تنی ہوئی کمان کی طرح نیم دراز تھی ۔ اس کی کالی زلفیں زہر ناک ناگنوں کی طرح اس کے شانوں پر لہرا رہی تھیں ۔ اس کی غزالی . . . . آنکھوں میں مقناطیس کے ٹکڑے تھے ۔ اس کے جسم کا گداز کمرے کی فضا میں عود اور عنبر کی طرح سلگ رہا تھا ۔ رابرٹ لانگ نے حیرت سے آنکھیں ملیں ۔

نجمہ کے ہونٹوں پر گلاب کی پتیاں سی کھلیں ۔

رابرٹ لانگ نے اپنی آنکھوں کو دوبارہ ملا ۔

نجمہ پھر مسکرائی ۔

" کشمیر سے آئی ہے ۔" موٹی عورت نے طلسم کو توڑتے ہوئے کہا ۔ " کشمیر کا نام تو تم نے سنا ہوگا ، جوان ؟ تمہاری یو ، این ، او ۔ وہاں کا جھگڑا چکا رہی ہے ۔ ہاں ، بڑی اچھی جگہ ہے ۔ سیب ، انگور ، ناشپاتیاں اور . . . ."

--- رابرٹ کے دل کے ساتھ اب اس کے صحافتی دماغ نے بھی ایک شدید کروٹ لی ۔ اس نے سوچا کہ شاید آج کی رات اس پر مسئلہ کشمیر کے کچھ راز بھی آشکار ہوں ۔ شاید کل صبح وہ اپنے اخبار کو ایک ایسا تاریخی ڈسپیچ ارسال کر سکے جس سے اس بین الاقوامی گتھی کو سلجھانے میں ایک نئی شاھراہ کا نشان مل سکے ۔ شائد ۔۔۔۔۔۔۔"

" پچاس روپے ۔" موٹی عورت نے بندر بیچنے والے کی طرح قیمت کا اعلان کر کے اس کمرے کے طلسم کو ایکبار پھر توڑ ڈالا ۔

پچاس روپے !

بندر !

نجمہ !

کشمیر !

یو، این، او ۔

اور امریکی نامہ نگار اپنا تاریخی ڈسپیچ تیار کرنے میں مشغول ھو گیا !

یہ مضمون ایک برٹش فوجی افسر کی ڈائری کے چند اقتسابات کا ترجمہ ہے۔ یہ افسر ۱۸۳۹ء میں کراچی آیا تھا اور ۱۸۵۱ء میں اس کی ڈائری لندن کے اشاعتی ادارے جیمس میڈن نے شائع کی تھی - مصنف نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھا تھا۔

کراچی

۳ فروری ۱۸۳۹ کی صبح کو جنگی جہاز " ویلزلی " اور باربرداری کے جہاز "حنا" نے قلعہ منوڑا کے مقابل لنگر ڈال دئیے ۔ ہمارے کمانڈر نے قلعہ کے حاکم کو للکارا کہ فوراً ہتھیار ڈال دو ۔

" میں بلوچی بچہ ہوں " قلعہ کے حاکم نے جواب دیا ۔ " ہم قلعہ خالی کرنے سے پہلے مرجانے کو ترجیح دیں گے ۔ "

چلو اچھا ہوا ۔ موت کے آرزو مندوں کو موت ضرور ملنی چاہئے ۔ یوں بھی ان مغرور بلوچیوں کو تمیز اور تہذیب سکھانا ہمارا فرض ہے ۔ یہی تو وہ فرض ہے جس کو ادا کرنے

لئے ہم نے اپنا عزیز وطن چھوڑا۔ اور اب ان کالے پانیوں میں در بدر مارے پھر رہے ہیں۔

ہمارے فوجی دستے جہاز سے اتر آئے اور منوڑا کی چٹان کی طرف بڑھے۔ چٹان کے دامن میں کچھ دیر سستا کر ہم نے اپنی اپنی رائفلیں بھر لیں اور ان پر تیز دھار خون کی پیاسی کرچوں کو چڑھا لیا۔ منوڑا کی چٹان پر موت کا سایہ واضح طور پر منڈلا رہا تھا۔ لیکن موت کے فرشتے کس کا انتظار کر رہے تھے؟ ہماری رجمنٹ کے دل کچھ بیٹھ سے گئے لیکن کمانڈر نے کڑک کر للکارا۔

"برطانیہ عظیم کے بہادر سپوتو۔ تاج اور ملک کے نام پر۔"

تاج اور ملک کے نام پر ہم نے بے دریغ حملہ کر دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے منوڑا کا قلعہ سر ہو گیا۔ قلعہ میں ایک ضعیف العمر سردار تھا۔ ایک جوان عورت تھی۔ اور ایک ننا سا بچہ تھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ گورنر جنرل نے کلکتہ سے ایک پیغام میں ہماری بہادری کو سراہا اور ہمارے کمانڈر کی عالی ہمتی۔ ہوشمندی کی بہت تعریف کی۔

منوڑا کا قلعہ سر ہوتے ہی کراچی کا شہر بھی ہمارے قبضہ میں آگیا۔ دوپہر کے قریب ہم نے بندرگاہ پر اترنا شروع کیا۔ سمندر میں زبردست تلاطم تھا۔ لہروں کے زیر و بم میں ہمارے کمانڈر کی محبوب بکری پانی میں

گر گئی جو اس نے بمبئی میں خرید کر بڑے شوق سے پالی تھی ۔ تین کالے سپاھی بکری کو بچانے کے لئے اسلحہ سمیت ایک ساتھ سمندر میں کود گئے ۔ دو سپاھیوں نے بکری کو کندھوں پر اٹھا لیا ۔ تیسرا سپاھی اپنے اسلحہ کے بوجھ سے بے دم ھو گیا اور آن کی آن ڈوب گیا ۔ رام جی نائک فرض کا پابند انسان تھا ۔ ڈوبتے وقت بھی اس نے اپنی رائفل کو بڑی مظبوطی سے تھام رکھا تھا افسوس کہ یہ ھتھیار سمندر کی تہ میں کسیٔ کام نہ آسکے گا ۔ ھماری رجمنٹ میں پہلے ھی رائفلوں کی بہت کمی ھے ۔

کراچی کی پورٹ کو بندرگاہ کہنا ستم ظرفی ھے ۔ پھر بھی یہ مقام سارے ساحل پر بہترین جگہ ھے ۔ اسے اچھی طرح ترقی دی جائے تو ، کراچی کلکتہ کا مقابلہ کر سکتی ھے ھم اس بندرگاہ کو پختہ تعمیر کردیں گے ۔ تجارتی در آمد بر آمد کے لئے یہ جگہ بہت موزوں ھے ۔ یوں بھی وسطی ایشیا میں جنگی ذخیرے جمع کرنے کے لئے یہ مقام بے حد اھم ھے ۔

کچھ لوگ کہتے ھیں کہ کراچی کا قدیمی نام کروکالی ھے ۔ جس کا ذکر یونانی دیو مالا میں آتا ھے ۔ یہ تاریخی رشتہ کراچی کے لئے باعث فخر ھے ۔ لیکن ایک چھوٹی سی دقت یہ ھے کہ کراچی کا شہر فقط ڈیڑھ سو سال پہلے آباد ھوا تھا ۔

کراچی میں داخل ہوتے ہی انسان کے کان ، ناک اور آنکھیں بڑی شدت سے متاثر ہوتی ہیں ۔ سماعت کے لئے چاروں طرف ایک مرثیا نما موسیقی پھیلی ہوئی ہے ۔ اس میں بازار والوں کی چیخ پکار ، عورتوں کی گالی گلوچ ۔ کتوں کی لمبی تانیں اور گدھوں کی مسلسل ڈھینچوں ڈھینچوں خاص طور پر نمایاں ہے جا بجا گلی سڑی مچھلیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں ان کا تعفن قوت شامہ کو مدد دیتا ہے ۔ شہر میں نالیوں کا رواج نہیں ۔ گندے پانی کا نکاس عمل تبخیر سے انجام پاتا ہے ۔ جو کوڑا کرکٹ گھروں کے اندر کام نہیں آتا وہ گھروں کے باہر رکھ دیا جاتا ہے ۔ صفائی کا زیادہ تر کام کوؤں چیلوں اور کتوں کے سپرد ہے چھوٹی چھوٹی تاریک دوکانوں سے ہلدی ۔ کڑوے تیل کی تیز لپٹیں آتی رہتی ہیں ۔ ان نوع بنوع خوشبوؤں کو سونگھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تازہ تازہ لاشوں کو حنوط کیا جا رہا ہو ۔

مکان مٹی کے بنے ہوئے ہیں کھڑکیاں ناپید ہیں ۔ البتہ چھوٹے چھوٹے روشندانوں میں سوکھی ہوئی مچھلیاں گرد میں اٹی پڑی ہیں ۔

مرد لمبے اور تن آور ہیں ۔ عورتوں کے لباس شوخ اور رنگین ہیں ۔ مسلمانوں کی پہچان ان کی لمبی لمبی گھنی اور گھنگھریالی داڑھیاں ہیں ۔ ہندوؤں کا رنگ زردی مائل ہے ۔ کالے کالے سرخ ہونٹوں والے حبشی زاد سقے پانی کی

مشکیں اٹھائے پھرتے ہیں - موٹے موٹے بنیئے دبلے پتلے ٹٹوؤں پر اینٹھ کر بیٹھتے ہیں - مسلمانوں کے عہد سے انہیں گھوڑوں اور خچروں پر بیٹھنے کی اجازت نہیں -

گھروں اور دکانوں کے سامنے بیٹھ کر بر سر عام ٹائلٹ کیا جاتا ہے - مسلمان کیکر یا نیم کی ٹہنیاں گلے میں مار مار کر منہ کی صفائی کرتے ہیں - ہندو سفید مٹی میں سرسوں کا تیل ملا کر صابن کی طرح استعمال کرتے ہیں - نہانے کے لئے دریائے لیاری ہے - اس میں پانی نہیں ہوتا - چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی جمع کر کے اس میں مچھلیاں دھوتے ہیں غسل کرتے ہیں اور پھر یہی پانی مٹکوں میں بھر کے پیا جاتا ہے -

آج ''مگر پیر'' کا میلہ ہے - یہ جگہ کراچی سے کوئی نو میل کے فاصلہ پر ہے - یہ میلہ ''حاجی مگر'' کی یاد میں منایا جاتا ہے - کسی وقت حاجی پیر اور اس کے تین بھائی یہاں آکر رہے تھے - آتے ہی انہوں نے اس مقام پر کرامات کے انبار لگا دئیے - ایک بھائی نے ایک انگلی سے گرم پانی کا چشمہ کھود ڈالا - اس پانی کا درجہ حرارت ۹۰ درجہ ہوتا ہے - دوسرے بھائی نے غالباً دوسری انگلی سے ایک اور چشمہ نکالا جس کا پانی ۱۲۰ درجہ گرم ہے - تیسرے بھائی نے چند پھولوں کو مگر مچھ میں تبدیل کر دیا - چھوتھے بھائی نے اپنی مسواک کو زمین میں گاڑ کر کھجور کا

درخت پیدا کر دیا ۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب سب سے بڑا بھائی مر گیا تو اس کے مزار پر "حاجی مگر پیر" کا مقبرہ تعمیر ہو گیا ۔ ایک چھوٹے سے تالاب میں اسی یا نوے کے قریب مگر مچھ ہر وقت موجود رہتے ہیں اگرچہ یہ مگرمچھ پھولوں کی اولاد ہیں لیکن ان کے جسم بے حد غلیظ اور بدبودار ہیں ۔ سب سے بڑے مگرمچھ کا نام مور صاحب ہے ۔ درگاہ کا متولی ایک ننگ دھڑنگ لمبا سا فقیر ہے ۔ "آؤ آؤ" کا نعرہ لگا کر مگرمچھوں کو اکھٹا کرتا ہے اور عقیدت مند بکریاں اور دنبے ذبح کر کے چڑھاوا چڑھاتے رہتے ہیں کچھ گوشت اور چھیچھڑے مگرمچھ کھا لیتے ہیں اچھا اچھا مال فقیر لے جاتا ہے ۔

"واہ واہ سبحان اللہ" مگرمچھوں کو گوشت کھاتا دیکھ کر عقیدت مند تحسین و آفرین کے نعرے لگاتے ہیں ۔

"مبارک باد ۔ مبارک باد" فقیر گوشت سنبھال کر جواب دیتا ہے "تمہاری نذر قبول ہوئی ۔ اب دنیا اور آخرت میں تم سرخرو رہو گے" ۔

میلے میں کراچی سے ناچنے والی لڑکیوں کا ایک گروہ بھی آیا ہوا ہے ۔ ان کی آنکھیں کالی اور بال لمبے ہیں ۔ عقیدت مندوں کے دل روحانیت میں رچے ہوئے ہیں ۔ لیکن ان کے جسم ان لڑکیوں کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں ۔

،، مگر تالاب ،، کا کیچڑ تبرک کے طور پر فروخت بھی ہوتا ہے۔ جوان عورتیں ایک طرف بیٹھ کر اس کیچڑ کو برکت کے طور پر اپنے جسم پر ملتی ہیں۔ اس عمل میں زائرین کو چند خوبصورت اجسام کی زیارت بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

میلہ ختم ہونے سے پہلے شیدی ناچ ہوتا ہے۔ ایک دائرے میں سرخ سبز اور نیلے رنگ کے بہت سے جھنڈے گاڑ دئے جاتے ہیں۔ انگیٹھیوں میں عود اور لوبان سلگایا جاتا ہے۔ ڈھول بجتے ہیں اور بہت سے ملے جلے مرد اور عورتیں نیم بیضوی دائروں میں ناچنا شروع کرتے ہیں۔ حاضرین قل قل قل کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں۔ ناچنے والے مرد جھوم جھوم کر گاتے ہیں۔ عورتیں مست ہو کر اپنی کمر لچکاتی ہیں کولھے مٹکاتی ہیں اور والہانہ طور پر بانہیں پھیلا کر کبھی گرتی ہیں کبھی بیٹھتی ہیں اور کبھی گھٹنے ٹیک کر زمین کے ساتھ سر مارتی ہیں۔ ان کے چمکیلے اور آبنوسی بدن پر پسینے کے قطرے عجب بہار دیتے ہیں۔۔۔۔

دن بھر کی گرمی۔ گرد اور غبار کے بعد کراچی کی رات بڑی سہانی ہوتی ہے۔ صاف شفاف آسمان پر تارے ٹمٹماتے ہیں۔ چاروں طرف صحرا کی پر اسرار خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ فضا میں سمندر کی ہلکی ہلکی سی نمی رچی ہوئی ہے۔ کراچی کے پیچھے صرف ڈیڑھ سو سال کا

غریبانہ ورثہ ہے ۔ لیکن اس کے سامنے مستقبل کی لامحدود صدیاں ہیں ۔ شاید ایک وقت ایسا بھی آئے جب اس کی بندرگاہ پکی بن جائے اور تاج کے نام پر آنے والے فوجیوں کی بکریاں سمندر میں نہ گرنے پائیں ۔ شاید یہاں کی سڑکیں پکی بن جائیں اور ان پر کہیں کہیں سایہ‌دار درخت بھی لگا دئے جائیں ۔ یہاں کے کوڑے کرکٹ کے متعفن انبار صاف ہو جائیں ۔ اور پینے کا پانی لیاری ندی کے خشک کناروں پر غلیظ اور کثیف گڑھوں میں جمع نہ کیا جائے ۔ شاید ۔ ۔ ۔ ۔

قانون

علی الصبح جب ریل گاڑی جموں توی کے قریب پہنچی، تو بڑا حسین منظر تھا۔ پنجاب کی جھلستی ہوئی لو کی جگہ خنک ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ سامنے ایک پہاڑی پر جموں کا شہر آباد تھا، جیسے کسی نشیب پر Mughroom (کھمب) اُگی ہوئی ہوں۔ پس منظر میں پہاڑوں کی چوٹیاں تہہ در تہہ متوازی خطوط کی طرح بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں، اور انہی کا نکتہ عروج برف پوش ہمالیہ کا وہ سلسلہ کوہ سے تھا، جو ان سب کے پیچھے ایک سنگلاخ چٹان کی طرح ایستادہ تھا۔

جس طرح جموں کے پس منظر میں پہاڑوں کی بلند سے بلند تر چوٹیاں ہیں۔ اسی طرح جموں شہر میں سب سے نمایاں چیز یہاں کے مندر ہیں۔ کالے مندر۔ سرخ مندر۔ سفید مندر۔

سونے کی چادروں میں لپٹے ہوئے زرکار مندر - رابرٹ لانگ نے دوربین لگا کر ان کے کلس گننے کی کوشش کی - لیکن جس طرح تارے گنتے وقت ہر خالی جگہ پر ایک نیا ستارہ جھلملانے لگتا ہے - بالکل اسی طرح ہر لمحہ کسی مکان یا درخت یا دیوار کی اوٹ سے ایک نئے مندر کا کلس نمودار ہو جاتا تھا - اور اس کی کوشش رائگاں جاتی تھی -

حکیم گوراندتہ مل جو لاہور سے سوار ہوا تھا رابرٹ کی مشکل بھانپ کر مسکرایا - اور کمال شفقت سے اس کی معلومات میں اضافہ فرمانے لگا وہ ایک بھاری بھر کم کوٹ میں ان دوائیوں کی شیشیاں اور پیکٹ بھر رہے تھے، جو وہ لاہور سے خرید کر لائے ہوئے ہیں - اور لائے ہوئے تھے - اس کوٹ کے اندر کی طرف بے شمار تہ خانے اور چور جیبیں بنی ہوئی تھیں - اور وہ ٹٹول ٹٹول کر ہر خالی جگہ شیشیاں اور ڈبے ٹھونس رہے تھے اس حرکت کے جواز میں فرمایا کہ ریاست میں دوائیوں پر تین سو فیصدی تک کسٹم ڈیوٹی عاید ہوتی ہے - ضرورت ایجاد کی ماں ہے - چنانچہ حکیم گوراندتہ ایسا ایماندار اور شریف انسان بھی حکیم گوراندتہ مل جیسا شریف مجبور ہے کہ وہ اپنے عجیب و غریب کوٹ کی جیبوں میں دواؤں کو چھپا کر کسٹم ڈیوٹی بچائے وہ اپنے شہر کا مسیحا نفس اور ہردلعزیز طبیب ہے - اس کا یہ اخلاقی فرض ہے، کہ وہ مفلس و نادار مریضوں کو کم سے کم قیمت پر دوائیاں فراہم کرے - اس فرض کی انجام دہی میں

اگر اسے - کسٹم سے بچنے کے لئے چوری یا دھوکہ دھی کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ھے، تو یہ کوئی جرم نہیں بلکہ عین ثواب ھے۔ اخلاقیات پر طبع آزمائی کے بعد حکیم صاحب مندروں کی طرف متوجہ ہوتے ھیں۔ اور رابرٹ لانگ کو اطلاع دیتے ھیں۔ کہ جموں شہر میں ۲۷ مندر ھیں - سونے کی چادر میں منڈھا ھوا رگھناتھ مندر جس میں ضرورت کے وقت حضور مہاراجہ بہادر بہ نفس نفیس قدم رنجہ فرماتے ھیں دیوانوں کا مندر - وزیروں کا مندر - تھنہ کے راجپوتوں کا مندر - منادر کے ذیلداروں کا مندر - - - - ذات بذات، رتبہ بہ رتبہ، - - - - - بنے ھوئے مندروں کی تفصیلات کے ساتھ حکیم گوراندتہ مل جموں کے نام کی وجہ تسمیہ پر بھی روشنی ڈالتا ھے - اور راجہ جامبولوچن سے لے کر مہاراج ادھیراج شری ھری سنگھ تک بہت سی تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات میں کچھ اس طرح الجھے کہ انکی تقریر کا مفہوم رابرٹ لانگ کی سمجھ سے بالا تر ھو جاتا ھے۔ در اصل یہ حکیم صاحب کا قصور نہیں - کیونکہ وہ رابرٹ سے زیادہ اپنے مداری کے تھیلے ایسے کوٹ اور دواؤں کے ڈبے کے ساتھ زیادہ مشغول ھیں - یوں بھی ایک خاندانی حکیم کا یہ فرض ھے، کہ وہ کسی غیر ملکی نامہ نگار پر وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنہ اپنے غریب مریضوں کے لئے سستی دوائیں فراہم کرنے کی زیادہ کوشش کرے!

اسی ڈبے میں ایک سردار جی بھی ھیں۔ غالباً کپڑے

کے تاجر ہیں - اور اپنے غریب گاھکوں کے لئے سلک ، بوسکی ، اور جارجٹ سستے داموں فراہم کرنے کی سر توڑ کوشش فرما رہے ہیں اپنے کپڑے اتار کر وہ سلک ، بوسکی ، اور جارجٹ کے ٹکڑے اپنی ٹانگوں ، پیٹ ، چھاتی ، اور بازؤں پر تہہ در تہہ لپیٹ لیتے ہیں اور ان کے اوپر پاجامہ ، قمیض ، واسکٹ اور کوٹ چڑھا لیتے ہیں اس ہیئت کذائی وہ ایک ایسے مریض کی طرح نظر آتے ہیں ، جس کے جسم کی ساری ھڈیاں کسی حادثے میں ٹوٹ گئی ہوں - اور پلاسٹر آف پیرس لگا کر اسے سر سے پاؤں تک پٹیوں میں باندھ دیا گیا ہو - حکیم گوراندتہ مل بھی اپنے کوٹ میں عجب الخلقت چیز نظر آتا ھے - لیکن کیا کریں - بچارے دونوں اپنے اپنے احساس فرض سے بے حد مجبور ہیں -

جموں میں ٹیکسیوں کا رواج نہیں - اس لئے رابرٹ لانگ حکیم گوراندتہ مل اور اپنے ہم سفر سردارجی کے ساتھ ایک ٹانگے میں سوار ہو جاتا ھے - کسٹم ھاؤس کے سامنے ایک وردی پوش محالدار ٹانگے کو روکتا ھے - اس کے آگے دو اور ٹانگوں کی تلاشی ہو رہی ھے - ٹرنک ، سوٹ کیس ، اور بستر سڑک کے عین درمیان کھلے پڑے ہیں - کسٹم ھاؤس کا ایک جواں سال افسر جس نے کھلے گلے کی زرد قمیص اور سفید پتلون پہنی ہوئی ھے ، ایک برقعہ پوش عورت کے برقعے کے اندر ھاتھ ڈال اس کی کمر اور سینے کی تلاشی لے رھا ھے ایک دبلا پتلا مریل سا آدمی جو اس کا خاوند یا بھائی ھے ،

پاس کھڑا غصے سے بل کھا کھا کر احتجاج کر رہا ہے۔ لیکن ایک وردی پوش سپاہی اپنے ہاتھ کا موٹا سا ڈنڈا دکھا کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

رابرٹ لانگ حکیم گوراندتہ مل سے پوچھتا ہے کہ کیا اس ریاست میں عورتوں کے جسم پر بھی محصول لگتا ہے؟

حکیم گوراندتہ مل حسب معمول اس کے سوال کے طنز آمیز تلخی کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ دہانہ پھاڑ کو ہنستا ہے۔ ور رابرٹ کو ایک راز کی بات بتاتا ہے، کہ مسلمان عورتوں کے ساتھ یہ حرکت جائز ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ سرکار کے خزانے کو دھوکہ دینے کے لئے انہوں نے اپنے برقعوں کے اندر مال چھپایا ہوا ہو!

برقعہ کے اندر اچھی طرح ٹٹول ٹٹول کر کسٹم ہاؤس کا جواں سال افسر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اور اپنے پاس کھڑے ہوئے وردی پوش سپاہی کو حکم دیتا ہے۔ "رام لال، جانے دو۔ وہاں پلپلے آموں کے سوا اور کچھ نہیں۔ جاؤ، گڑوی میں پانی لاؤ۔ اور میرے ہاتھ دھلاؤ۔ خواہ مخواہ بدمزہ ہو گئے، صبح صبح۔"

دوسرے ٹانگے میں ایک شخص واویلا مچا رہا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے سیالکوٹ سے سیر بھر مٹھائی لیتا آیا ہے۔ اب کسٹم والے ڈیڑھ روپیہ کی مٹھائی پر ۱۳ آنے محصول طلب کر رہے ہیں۔ اس بار سے بچنے کے لئے وہ ٹانگے میں

بیٹھے بیٹھے جتنی مٹھائی کھا سکتا ہے کھا لیتا ہے۔ اور باقی ماندہ پر آس پاس منڈلاتے ہوئے وردی پوش سپاہی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

جب رابرٹ لانگ والے ٹانگے کی باری آتی ہے، تو حکیم گورا ندتہ مل ہاتھ جوڑ کر کسٹم ہاؤس کے جواں سال افسر کو سلام کرتا ہے۔ کیلاش جی نمستے۔ یہ صاحب بہادر ریذیڈنسی سے آئے ہیں۔ شاید سرکار کے لئے ضروری کاغذات لائے ہوں معلوم نہیں گیسٹ ہاؤس کی کار ابھی تک کیوں نہیں پہنچی۔ جب سے سرکار نے کرنیل عدالت خان کو گیسٹ ہاؤس کا انچارج بنایا ہے۔ سارا انتظام ہی درہم برہم ہو گیا ہے۔ خیر، میں دکان پر پہنچتے ہی سارا انتظام کر دوں گا۔ بھلا سوچئے تو سہی کیلاش جی۔ ہم سرکار کی بدنامی کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ اچھا کیلاش جی نمستے۔

کیلاش اپنی فیلٹ ہیٹ اٹھا کر رابرٹ لانگ کو سلام کرتا ہے۔ اور ان کا ٹانگہ بڑی عزت اور رعب کے ساتھ کسٹم ہاؤس سے روانہ ہوتا ہے۔ رابرٹ لانگ حکیم گورا ندتہ مل کے سفید جھوٹ پر کسی قسم کا احتجاج نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ چال چلنے سے اس کے دو کیمرے، نصف درجن فلمیں، دوربین، اور دیگر بہت سی اشیاء بھی بڑی صفائی کے ساتھ کسٹم کے جھنجھٹ سے بچ نکلتی ہیں!

ڈاک بنگلہ پہنچ کر جب رابرٹ لانگ شیو اور غسل سے فارغ ہوا تو حسن علی خانساماں اپنی کتاب اٹھائے اس سے ناشتہ ، لنچ اور ڈنر کا آرڈر لینے آیا ۔

” جناب ، بریک فاسٹ پر پوریچ ، ٹوسٹ ، مکھن ، جیم ، چائے یا کافی اور فروٹ تیار ہوگا ۔ صاحب انڈا بوائل مانگتا یا فرائی ؟ “ حسن علی خانساماں لہجے رازبان کے حساب سے جان میکفرسن کے بیرے افضل کی برادری کا قریبی رشتہ دار معلوم ہوتا تھا ۔

رابرٹ لانگ نے کافی اور تلے ہوئے انڈوں کی فرمائش کی ۔

لنچ کے لئے حسن علی خانساماں نے سوپ ، مچھلی ، کولڈ مٹن ، سبزی ، پلاؤ بنانا مری ٹرز ، اور کافی کا حکم لگایا ۔

رابرٹ لانگ نے سر تسلیم خم کیا ۔

جب ڈنر کی باری آئی ، تو حسن علی خانساماں اچکن کی پیٹی پر ھاتھ باندھ کے رابرٹ لانگ کے حکم کے انتظار میں ھمہ تن گوش کھڑا ھو گیا ۔

رابرٹ لانگ بھی سنبھل کر ھو بیٹھا ۔ معاً اسے شاھد کی بات یاد آئی کہ جموں اور کشمیر کے ڈاک بنگلوں میں ڈنر

کے ہر کورس میں ایک نیا رومان پوشیدہ ہوتا ہے ۔ چنانچہ جب چکن کا حکم دیا جائے ، تو خانساماں محض مرغی پکاتا ہے۔ لیکن اگر چوزے کی فرمائش ہو تو ۱۵ یا ۱۶ برس کی تازہ چھوکری حاضر ہوتی ہے۔ اور مرغی مانگئے تو اس سے زیادہ ہر عمر اور ہر سائز کی عورت ملتی ہے ۔ رابرٹ لانگ کے چہرے پر شرارت کی مسکراہٹ پیدا ہوئی ، اور اس نے حسن علی خانساماں پر کچھ طبع آزمائی کا فیصلہ کر لیا ۔

" خانساماں تمہارا نام کیا ؟ " رابرٹ لانگ نے کچھ کچھ بے تکلفی کی ابتدا کی ۔

" صاحب ، ہمارا نام حسن علی خاں خانساماں ولد

جشن علی خاں خانساماں ہے۔ تین پشت سے ہم برابر اس ڈاک بنگلے میں کام کرتا ہے۔ " حسن علی اپنے نام کے ساتھ التزام سے لگاتا تھا جیسے شاعر تخلص کو استعمال کرتا ہے۔

" بہت خوب ، تم بڑے خاندانی شخص نظر آتے ہو۔ "

" ہمارا کیا منہ ، جناب ۔ ہم تو صاحب لوگ کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتا ہے آپکا دعا سے تین پشت سے پبلس کا سارا سپلائی بھی برابر ہمارے ھاتھ سے جاتا ہے۔ "

" آہا ، پھر تو تم بڑے کار آمد اور تجربہ کار انسان ہو۔ " رابرٹ لانگ نے خانساماں کو شہ دی ۔

"صاحب، ہم اپنے منہ سے کیا بول سکتا ہے۔ ہم صاحب لوگ کا خدمت برابر اپنا فرض سمجھتا ہے۔"

"اچھا تو خانساماں، پیلس میں چوزہ زیادہ چلتا ہے یا مرغی؟" رابرٹ لانگ نے دریافت کیا۔

اس سوال پر خانساماں ذرا سنبھل کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا، اور کن آنکھیوں سے بغور رابرٹ لانگ کا جائزہ لینے لگا۔

رابرٹ اس کی ہچکچاہٹ کو تاڑ گیا۔

"گھبراؤ نہیں، خانساماں۔" اس نے کہا۔ "میں کوئی ریزیڈنسی سے نہیں آیا۔ بلکہ محض ایک ٹورسٹ ہوں۔ اور امریکہ میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں"

صاحب امریکی ہے؟ صاحب ٹورسٹ ہے؟ صاحب بولتا کہ صاحب ریزیڈنسی سے نہیں آیا" خانساماں نے مزید اطمینان کے لئے تفتیش کی۔

"ہاں، خانساماں۔ تمہارا خیال بالکل درست ہے۔"

اب حسن علی خاں نے کچھ اطمینان کا سانس لیا۔ صاحب پوچھنا مانگتا کہ پیلس میں مرغی زیادہ لگتا یا چوزہ؟"

"ہاں، خانساماں۔ بالکل ٹھیک۔"

جواب دینے سے پہلے خانساماں نے بڑی احتیاط سے

دائیں بائیں آگے پیچھے گھوم کر جائزہ لیا، کہ کوئی ان کی باتیں تو نہیں سن رہا۔ اس نے دیکھا کہ برآمدے میں کالو مہتر جھاڑو دینے کے بہانے ان کی طرف کان لگائے ہمہ تن گوش کھڑا ہے۔

حسن علی خانساماں کڑک کر اس کی طرف لپکا۔ "تخم خنزیر تم اس طرف اپنی ماں حرامزادی کے پاس آتا ہے؟ - جاؤ دوسری طرف کام کرو۔ لعین - بے شرم - کمینہ - - - -

کالو مہتر سے نپٹ کر خانساماں واپس آیا۔ اور دوبارہ گردو پیش کا جائزہ لے کر اس نے رابرٹ لانگ کو اس بھید سے آگاہ کیا، کہ مہاراجہ کے محل میں کم سن لڑکیاں اور جوان عورتیں دونوں برابر کام آتی ہیں۔

"صاحب پہلے ہم برابر مسلمان چھوکری سپلائی کرتا تھا۔ کیونکہ اس وطن میں یہ جنس غریب مستا ہے۔" اس دن سے ہم کو بہت منافع بچتا تھا۔ حسن علی خانساماں نے اپنے منہ پر زور سے تھپڑ مار کر کہا۔ "صاحب اس وقت ہم کافر تھا۔ ہم خنزیر تھا۔ ہم شیطان کا بچہ تھا۔" اپنی شان میں ہر کلمے پر خانساماں اپنے دائیں اور بائیں رخساروں پر اس زور سے تھپڑ مار رہا تھا، کہ اس کی آنکھوں سے بے اختیار پانی نکل آیا۔

"لیکن صاحب، با خدا اب ہم نے توبہ کر لیا ہے۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "اب ہم مسلمان چھوکری کو اپنا ماں بہن سمجھتا ہے۔ اب ہم پیلس سے لے کر ڈاک بنگلے تک ہر جگہ صرف ہندو چھوکری لگاتا ہے۔ اس میں ہم کو منافع بہت کم بچتا ہے لیکن جناب پروا نہیں۔ اب ہم نے توبہ کر لیا ہے۔ با خدا —" حسن علی خانساماں نے کندھے پر سے رکابیاں صاف کرنے والا انگوچھا اتار کر پہلے اس سے آنکھیں پونچھیں اور پھر اس میں زور سے اپنی ناک صاف کی۔

صاحب جب حق تعالیٰ سے ہمارا حساب بے باق ہو جائیگا۔ تو ہم فوراً یہ دھندھا چھوڑ دیگا۔ اور آگے اپنا عاقبت خراب نہیں کریگا۔ صاحب، ہم ہجرت کر کے مدینہ شریف چلا جائیگا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر سر پٹک پٹک کے اپنا گناہ کا معافی مانگے گا۔ صاحب ہم بڑا موذی گناہگار ہے۔" رسول اللہ کے نام پر حسن علی نے شہادت کی انگلیاں ملا کر چوما اور بڑی عقیدت سے اپنی آنکھوں سے لگایا۔

عورتوں کی دلالی اور روحانیات کے ذکر کے بعد حسن علی خانساماں نے سیاست کی طرف توجہ مبذول کی۔ اور بڑے رازدارانہ لہجے میں رابرٹ لانگ کو آگاہ کیا کہ پہلے وہ نیشنلی تھا، لیکن اب مسلم کانفرنسی ہے۔" صاحب جب

حضرت جناح صاحب جموں تشریف لایا تھا ، تو اللہ تعالیٰ کی برکت سے اس ڈاک بنگلے میں ٹھہرا تھا ۔ صاحب ہم نے خود اپنا ہاتھ سے حضرت جناح صاحب کا کھانا پکایا تھا اور بوٹ صاف کیا تھا اور سوٹ پر استری کیا تھا ۔ " حسن علی خاں نے اپنے ہاتھ اٹھا کر انہیں بڑے پیار سے دیکھا اور پھر توظیماً انہیں اپنی سفید داڑھی پر ملا ۔

ان انکشافات کے بعد حسن علی خانساماں نے ایکبار پھر رکابیاں صاف کرنے والے انگوچھے سے ناک صاف کی ۔ اور پھر ، اچکن اور پیٹی کو درست کر کے اپنے آبائی Professional انداز میں کھڑا ہو گیا ۔

" صاحب ، آج رات جناب ڈنر پر چکن مانگتا یا چوزہ مانگتا یا مرغی مانگتا ؟ ہم ہر چیز صاحب کی مرضی کے موافق پیش کریگا ۔ " ۔ اس نے دریافت کیا ۔

رابرٹ نے صرف چکن کی فرمائش کی ۔

آرڈر لینے کے بعد جب خانساماں رابرٹ کے کمرے سے نکلا تو اس نے دیکھا ، کہ کالو مہتر دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا ھے ۔ حسن علی نے لپک کر اس کو گردن سے پکڑ لیا ، اور اس کے منہ پر زور زور کے طمانچوں اور گھونسوں کی بارش برسانے لگا ۔ جب اس کے ہاتھ تھک گئے ، تو اس نے حسب توفیق پاؤں سے بھی کالو بھنگی کی

مرمت کی - لیکن یہ حربہ کچھ زیادہ کام نہ آیا کیونکہ حسن علی خانساماں ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا -

مار کھانے کے بعد کالو مہتر نے اطمینان کی سانس لی ، اور خانساماں کے پاؤں پر سر رکھ کے گڑ گڑا کر کہا - "خانساماں جی - اب تو اس غریب پر مہربانی کرو - تمہارے سر کی سوگند اب تو نتھیا بالکل تیار ہے -"

"تخم خنزیر - ابھی اس کا عمر ۱۲ برس ہے - تم اس کو تیار کیسے بولتا ہے؟ دو برس اور صبر کرو - قانون میں لڑکی ۱۴ برس سے پہلے بالغ نہیں ہوتا -"

کالو مہتر نے کچھ اور گڑگڑانا چاہا - لیکن حسن علی خانساماں نے اس کے منہ پر تھوک کر خاموش کر دیا - "حرامزادے کے بچے - تم ہمکو جیل بھیجنا چاہتا؟ بخدا ہم نابالغ چھوکری کو خراب کر کے اپنا عاقبت نہیں بگاڑیگا - - -"

خانساماں بڑبڑاتا ہوا - لنگڑاتا ہوا وہاں سے چلدیا لیکن کالو مہتر اپنی جگہ کھڑا دیر تک اُسے حسرت و یاس سے دیکھتا رہا - نتھیا اس کی پانچ بیٹیوں میں سب سے بڑی لڑکی تھی - اور کالو نے اسے بڑے ارمانوں سے پالا تھا - زندگی کا ہر سال جو نتھیا کے خون میں گرمی اور اس کے بڑھتے ہوئے جسم میں تناؤ پیدا کرتا تھا ، کالو کے لئے بڑی خوش آیندہ توقعات کا پیش خیمہ ہوتا تھا - نتھیا سارے خاندان کی امیدوں کا سہارا

تھی - جب وہ جوان ہو گی تو حسن علی خانساں کی مدد سے وہ ضرور ڈاک بنگلے میں دھندے پر لگ جائے گی - پھر تو بس کالو کے دن بھی پھرینگے - وہ نوکری چھوڑ کر چین کی بنسی بجائیگا۔ اور دن رات جی کھول کر اپنی محبوب چرس پیا کریگا۔ نتھیا کی کمائی سے اس کی چار چھوٹی بہنوں کی بیاہ شادی کا سامان بھی ہو جائیگا - اور شاید نتھیا کی ماں کا علاج بھی ہو جائے ، جو کئی برس سے چارپائی سے لگی تپ دق کے مرض میں گھل گھل کر دم توڑ رہی تھی - نتھیا کی جوانی کا بڑے شوق اور بڑی بے صبری سے منتظر تھا - جس طرح آم بیچنے والا کچے آموں کو بھوسے میں دبا کر ان کے پکنے کا بے قراری سے انتظار کرتا ہے !

اس وقت گلابو بھنگی کو مہاراج ادھیراج کے خزانے سے مبلغ سات روپے آٹھ آنے ماہوار ملتے تھے - پچھلے سال جب سرکار ولایت سے پولو کا میچ جیت کر واپس آئے تھے ، تو اس خوشی کی یادگار میں اس کی تنخواہ میں چار آنے ماہوار کا اضافہ بھی ہوا تھا - لیکن ان پونے آٹھ روپوں میں سے بارہ آنے میونسپلٹی کا داروغہ وصول کر لیا کرتا تھا - ایک روپیہ سونے کے کلس والے رگھوناتھ مندر کے محکمہ دھرم ارتھ میں داخل ہو جاتا تھا - اور باقی چھ روپوں میں نہ تو گلابو کو جی بھر کر چرس ملتی تھی - نہ اس کی بیٹیوں کی شادی بیاہ کا سامان ہو سکتا تھا - اور نہ ھی اس کی مدقوق بیوی کا علاج ممکن تھا - چنانچہ گلابو بھنگی اور اس کا سارا خاندان اور اب

کچھ عرصہ سے کالو کا جی یہ دیکھ کر باغ باغ ہو رہا تھا ، کہ نتھیا کا جسم جوانی کے تناؤ سے کمان کی طرح کھنچ گیا تھا ۔ اس کی سیاہ جلد کے نیچے گرم گرم خون کی سرخی جوش کھا رہی تھی ۔ اس کی آنکھیں بے قرار مخمور سی رہنے لگی تھیں ۔ اور چال میں بھی ایک مستانہ سی لچک اور بے باکی آ گئی تھی ۔ یہ علامات کالو کے مستقبل کا پیش خیمہ تھیں ۔ لیکن خانساماں کی باتوں نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا ۔ وہ حرامزادہ اسے ابھی دو برس اور صبر کرنے کی تلقین کر رہا تھا ۔

اگرچہ جب پشپا پہلی بار پیلس گئی تھی ، تو اس کی عمر گیارہ برس سے ایک دن بھی زیادہ نہ تھی ۔ اور کملا ، اور رنیکا ، اور شانتی ، اور پریتم ، اور جمنا ۔ ۔ ۔ ۔ اور یوں بھی کالو مہتر کو زمانے کے اس عجیب انصاف پر بڑا غصہ آیا ۔ کہ قانون میں لڑکی ۱۴ برس سے پہلے جوان ہی نہیں ہو سکتی ۔ کاش کہ قانون بنانے والوں نے ایک نظر اس کی نتھیا کو بھی دیکھا ہوتا ۔

پرنس سمرقندی

ننده بس سروس کی جس اسٹیشن ویگن میں رابرٹ لانگ کو جگہ ملی اس میں پانچ سواریاں اور بھی تھیں - پرنس آف ویلز کالج جموں کے ایک کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب تھے جو کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہونے پر سرینگر جا رہے تھے - ان کے ساتھ ان کی پنڈتانی بیوی صاحبہ تھیں - اگرچہ اس وقت جموں میں کوئی ۱۱۰ درجہ حرارت کی گرمی تھی، لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر پروفیسر صاحب نے نسواری رنگ کے پٹو کا چوڑیدار پاجامہ ، اس کا ہمرنگ گلے کا گرم کوٹ ، اور سر پر آونی کنٹوپ پہنا ہوا تھا - کندھوں پر اعلیٰ پشمینے کی کتھئی رنگ کی کاڑھی ہوئی چادر تھی - پروفیسر صاحب کے کوٹ کی جیبیں پھول کر باھر کو نکلی ہوئی تھیں - ایک میں نمک ، الائچی ، سیاہ مرچ ، ادرک ، لونگ اور دارچینی

کی پڑیاں تھیں ۔ دوسری جیب میں لیموں اور امرت دھارے کی شیشیوں کے ڈبے تھے ۔ یہ انتظامات پروفیسر صاحب کی بیوی کے لئے تھے ، جسے بانہال روڈ کے پے درپے موڑوں پر شدید چکر آیا کرتے تھے ۔ پنڈتانی نے سفید لٹھے کا فرن پہنا ہوا تھا، جو کلیسائی راہباؤں کے لبادے کی طرح ٹخنوں ٹخنوں تک آتا تھا ۔ پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں تھیں ۔ سر پر گہرے سرخ پشمینے کی خوبصورت چادر تھی جس کے نیچے سے اس کی دراز زلفوں کا جوڑا سانپ کے پھن کی طرح جھانک رہا تھا۔ اس کی عمر کوئی تیس برس کے قریب ہو گی ۔ رنگ گورا تھا، جس میں گلابی رنگ کی ہلکی سی تحریر جھلک رہی تھی ۔ جموں کی تمازت سے رخساروں کے گلاب مرجھا گئے تھے ۔ اب سرینگر پہنچتے ہی ان پر تازگی آ جائیگی ۔ اور اس کے گال پھر کانگڑی میں دہکتے ہوئے کوئلوں کی طرح تمتمانے لگیں گے ۔ پنڈتانی کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز اس کی ناک اور آنکھیں تھیں ۔ اس کی ستواں ناک میں ایک ناقابل بیان نزاکت تھی، جیسے دودھئی بلور کو تراش کر آسے سانچے میں ڈھالا گیا ہو ۔ اس کی گہری نیلگوں آنکھوں میں بڑا حسین حزن تھا ۔ جیسے سکوت شام میں کسی دور دراز جھیل پر سکون کی اداسی چھائی ہوئی ہو ۔ ماتھے پر قشقہ تھا ۔ مانگ میں سہاگ کے سندور کی لکیر تھی ۔ اور ہونٹوں پر اخروٹ کے چھلکے کی سرخی کبوتر کے خون کی طرح چمک رہی تھی ۔ پنڈتانی کے ہاتھ میں سرخ ، سبز اور نیلے ابرک سے منڈھی ہوئی ایک

کانگڑی تھی ۔ اس میں وہ گھر سے راکھ بھر کے لائی تھی ۔ تاکہ بانہال سڑک کے موڑوں پر جب اس کا جی متلائے ، تو وہ آسانی سے اس میں قے کر سکے ۔

اسی اسٹیشن ویگن میں پرنس عبدالرحیم سمرقندی بھی تھے ۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم صاحبہ کے علاوہ ایک حسین و جمیل جوان پارسی خاتون تھی ۔ اس کا نام لولو تھا ۔ اور وہ پرنس سمرقندی کے ساتھ مسوری سے مہاراجہ بہادر کے مہمان کی حیثیت سے کشمیر میں موسم گرما گزارنے آ رہی تھی ۔

پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے گیبرڈین کی جودھپوری برجس اور بند گلے کا چھوٹا کوٹ پہنا ہوا تھا ۔ سر پر ہلکے فاختئی رنگ کی فیلٹ ہیٹ تھی ۔ جس پر موتیوں اور ھیروں سے جڑا ھوا مور کے پر کا بروچ آویزاں تھا ۔ پرنس سمرقندی کی عمر پینتالیس برس سے زیادہ نہیں تھی ۔ لیکن دیکھنے میں وہ کافی معمر نظر آتے تھے ۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر ریشم کی سلوٹوں کی طرح جھریاں ھی جھریاں تھیں ۔ اور آنکھوں کے پپوٹوں کے نیچے سیاھی مائل حلقوں کے درمیان سوجے ھوئے گوشت کی تھیلیاں سی لٹک رھی تھیں ۔ اگر غور سے نظر جما کر دیکھا جائے ، تو پرنس سمرقندی کے ھاتھوں میں رعشہ کی ھلکی سی کپکپاھٹ بھی تھی ، جسے چھپانے کے لئے وہ باتیں کرتے وقت اپنے ھاتھوں کو بار بار بڑے ڈرامائی انداز میں جھٹکا کرتے تھے ۔ جب وہ باتیں نہ کر رہے ھوں ، تو ان کے

ہاتھ عموماً ایک خوبصورت ریشمیں اسکارف سے کھیلتے رہتے تھے ، جو ہر وقت اس مقصد کے لئے ان کی جیب میں موجود رہتا تھا ۔

بیگم سمرقندی کی عمر اپنے خاوند سے کوئی دس برس کم تھی ۔ لیکن شکل و شباہت سے وہ پچیس چھبیس برس کی نوخیز دلہن سے زیادہ نظر نہ آتی تھی ۔ اس کا قد سرو کی طرح بلند اور جسم چنار کی طرح majestic تھا ۔ آنکھیں بڑی بڑی اور غزالی تھیں ۔ جلد میں ایرانی قالینوں ایسی نرمی اور دبازت کا احساس تھا ۔ اور رخسار قندھاری اناروں کی طرح دھکتے تھے ۔ بیگم سمرقندی کے بال کمر کمر تک لانبے تھے ، اور وہ انہیں بڑی خوبصورت لا پرواھی کے ساتھ اپنے شانوں پر کھلا چھوڑ دیتی تھی ۔ اس کے سراپا میں جوانی اور صحت اور نسوانیت کی بڑی دلکش تکمیل نظر آتی تھی ۔

پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے اپنا شجرہ نسب اصلی آرٹ پیپر پر سنہری حروف میں چھپوایا ہوا تھا ، جس کے مطابق ان کا حسب نسب چند پشت پہلے سمرقند اور بخارا کے شاہی خاندان کے ساتھ ملتا تھا ۔ جب ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا آفتاب غروب ہوا، تو پرنس عبدالرحیم کے آبا و اجداد غالباً اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دینے کے لئے ہندوستان میں وارد ہوئے ۔ یہاں آکر انہوں نے کمپنی بہادر کے نیچے بڑے بڑے عہدے حاصل کئے ۔ ان کی دانست میں کمپنی بہادر

ملکہ وکٹوریہ اعظم کے فرزند ارجمند کا اسم گرامی تھا، جو اپنی والدہ ماجدہ کا سکہ چلانے کے لئے بہ نفس نفیس ہندوستان بھیجے گئے تھے - لیکن رفتہ رفتہ جب انہیں معلوم ہوا، کہ کمپنی بہادر تو محض تاجروں کی ایک جماعت کا نام ہے، تو اس کی ملازمت کو انہوں نے اپنی شاہی خاندان کے روایات کے منافی سمجھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کو خیر باد کہا، اور ہندوستانی راجوں مہاراجوں سے تعلقات پیدا کئے - یہاں بھی انہیں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی - چنانچہ پرنس عبدالرحیم سمرقندی اب تک بڑی وفاداری سے اپنے خاندان کی روایات پر گامزن تھے - اور مہاراجگان کشمیر، پٹیالہ، الور، جے پور، بیکانیر وغیرہ سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے - ان میں سب سے زیادہ لگاؤ انہیں جموں و کشمیر کے مہاراجہ کے ساتھ تھا - اور وہ پچھلے ستائیس برس سے برابر اس کی مصاحبت میں چلے آ رہے تھے - اس وفاداری اور دوستی کے صلہ میں سرکار نے انہیں سرینگر کے قریب ایک وسیع و عریض باغ، ایک شاندار کوٹھی، دو پیکارڈ موٹروں کے علاوہ دربار میں کرسی نشین درجہ اول کا اعزاز عطا فرمایا تھا -

راجوں مہاراجوں کی برادری میں پرنس عبدالرحیم سمرقندی کی بڑی مانگ تھی - ایک ماہر اور جدی و پشتی درباری ہونے کے علاوہ وہ ایک اچھے دوست اور وفادار ساتھی بھی تھے - اور ان کے کمالات کا شہرہ یورپ اور ہندوستان کے شاہی حلقوں میں عام تھا - مہاراجگان اور مہارانیوں کی مشکلات اور

ضروریات کو فوراً بھانپ جانا اور چشم زدن میں ان کے حل فراہم کر دینا ان کے بائیں ھاتھ کا کھیل تھا۔ مہاراجہ الور کی ضروریات کے پیش نظر پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا، کہ ریاست میں ہر اسامی کے لئے درخواست کے ساتھ امیدوار کی تازہ ترین فوٹو بھی ضرور آنا چاہئے۔ یہ زریں مشورہ کچھ ایسا کار آمد ثابت ھوا، کہ دیکھتے ھی دیکھتے راج پپلا، چھتیس گڑھ، اور ایسٹرن سٹیٹس ایجنسی کے سب راجوں اور رانیوں نے اس رسم کو بڑے شد و مد سے اپنا لیا۔

مہاراجہ پٹیالہ کی اکتالیسویں سالگرہ پر پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے انہیں ایک بجلی کی مشین تحفہ دی تھی، جو انہوں نے خاص فرمائش کر کے پیرس میں بنوائی تھی۔ اس مشین کی مدد سے مہاراجہ صاحب اکتالیس سال کی عمر میں بھی گیارہ عورتوں کی ٹیم کے ساتھ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ فٹ بال کا میچ کھیل سکتے تھے۔ یوں بھی شاھی خاندانوں پر پرنس سمرقندی کا فیض بڑا عام تھا۔ بانجھ مہارانیوں اور پیدائشی نامرد مہاراجوں کے ھاں ولیعہد پیدا کرنا ان کا خاص کمال تھا، جس کی برکت سے وہ ھندوستان کے بے شمار شاھی خاندانوں کی نسل برقرار رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ ریاست جموں و کشمیر پر بھی ان کا بڑا احسان تھا۔ جب حضور مہاراجہ بہادر کی عمر چالیس برس ھونے کو آئی، اور یکے بعد دیگرے چار مہارانیوں کے باوجود راج محل میں ولی عہد کے کوئی آثار

نظر نہ آئے ، تو راج دربار میں بڑی تشویش پیدا ہونے لگی ۔ خاندان کی بڑی بوڑھیوں نے ہردوار جا کر چلہ کشی کی ۔ راج گرو نے سونے اور چاندی کی جھنکار سے اپنے سوئے ہوئے خداؤں کو جگانے کی کوشش کی ۔ سونے کے کلس والے رگھو ناتھ مندر کے پجاریوں نے بھی حسب توفیق ھاتھ پاؤں مارے ۔ فرانس ، جرمنی ، انگلستان اور امریکہ سے بڑے بڑے ڈاکٹر بھی آئے ۔ ایک یوگی کے کہنے پر خود مہاراجہ بہادر بھی صبح سویرے لنگوٹ باندھ کر شبنمی گھاس پر ۔ ۔ ۔ ۔ آسن کی مشق فرمانے لگے ۔ لیکن شاہی نسل کے جو ناکے بند ہو چکے تھے ، وہ بند ھی رہے ۔ ساری ریاست کی ڈوگرہ اور راجپوت برادری پر مایوسی کا عالم چھانے لگا ۔ ولی عہد کا نہ ہونا نہ صرف راج گدی کے لئے پیچیدگیوں کا موجب ہو گا ۔ بلکہ یہ ڈوگرہ اور راجپوتوں کی مردانگی پر بھی کلنک کا زبردست ٹیکا تھا ۔ چوتھی مہارانی کانگڑے کی تھی ۔ اور وھاں کے راجپوت ابھی سے جموں کے ڈوگرہ راجپوتوں پر طعن و تشنیع پر اتر آئے تھے ۔ اس نازک وقت پر پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے اپنی کرامت دکھائی ، اور مہارانی تارا دیوی کے بطن سے ایک خالص سو فیصدی راجپوتی خون والا ولی عہد برآمد کر کے انہوں نے ریاست جموں و کشمیر کے ڈوگروں کی لاج رکھ لی ۔ یہ معجزہ پیرس میں سر انجام دیا گیا تھا ، اور اس کی برکت سے مہاراجہ کو یوراج ، مہارانی کو بیٹا ، ٹھاکر جموال سنگھ کو ڈیڑھ لاکھ سالانہ جاگیر ، اور پرنس عبدالرحیم سمرقندی کو سرینگر

کے مضافات میں پھولوں اور پھلوں کے وسیع باغات عطا ہوئے تھے۔

اسٹیشن ویگن میں داخل ہوتی ہی بیگم سمرقندی نے ناک بھوں چڑھا کر احتجاج کیا۔ "ڈارلنگ ہم اس کباڑخانے میں کیسے سفر کرینگے؟ ہائے میرا تو یہاں دم گھٹتا ہے۔" بیگم سمرقندی کے لہجے میں ایک خوبصورت سی بیگانگی تھی، جو سمرقند اور بخارا کے شاہی خاندان کے افراد کے لہجہ میں بہر حال ہونی ہی چاہئے!

پرنس سمرقندی نے اپنی بیگم کو کم اور اسٹیشن ویگن کے دوسرے مسافروں کو زیادہ مخاطب کر کے اس بات کی صفائی پیش کی، کہ وہ آج اپنی دو دو پیکارڈ گاڑیاں چھوڑ کر کرائے کی اس ویگن پر سوار ہونے کے لئے کیوں مجبور ہوئے ہیں۔ ایک پیکارڈ جس پر وہ مسوری سے آ رہے تھے، جموں پہنچ کر خراب ہو گئی۔ اگر وہ سرینگر ٹیلیفون کر دیتے، تو شام تک ان کی دوسری پیکارڈ بھی آ جاتی۔ لیکن جموں کی گرمی میں سارا دن کون بسر کرتا؟ یوں بھی آن کے ایک اشارے پر صوبہ جموں کے سارے افسر، جاگیردار، سفید پوش اور کرسی نشین اپنی موٹر گاڑیاں ان کی خدمت میں پیش کرنے میں بڑا فخر محسوس کرتے۔ لیکن اپنے آرام کے لئے دوسروں کو تکلیف پہنچانا ان کے اصول کے خلاف ہے۔ "صاحب مہربان، صرف آٹھ نو گھنٹے کی تو بات ہے۔ شام

تک ہم لوگ سرینگر پہنچ جائینگے ۔ اس وقت تک جس طرح ہو سکے گزارا کرنا چاہئے ۔"

اس تقریر کے بعد انہوں نے مسافروں کے چہرے پر آئے ہوئے تاثرات کو غور سے بھانپا ۔ کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب نے ان کا رتبہ پہچان کر پرنس عبدالرحیم سمرقندی کو خوب جھک کر سلام کیا ۔ خاوند کا اشارہ پا کر ان کی پنڈتانی نے بھی اپنے مرمریں مخروطی ھاتھ جوڑ کر بیگم سمرقندی کو پرنام کیا ۔ اور وہ دونوں میاں بیوی پچھلی سیٹ پر یوں سمٹ کر بیٹھ گئے ، جیسے انہوں نے اس ویگن پر سوار ہو کر پرنس سمرقندی کی شان میں کوئی بڑی بھاری گستاخی کی ہو۔

رابرٹ لانگ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا ۔ جہاں سفید چمڑی سے واسطہ ہو ، وھاں پرنس سمرقندی ایک مختلف Social order کے قائل تھے ۔ چنانچہ انہوں نے خود پیش قدمی کر کے رابرٹ کے ساتھ اپنا تعارف کرایا ، اور بڑی نیازمندی سے معذرت کی کہ ان کے ساتھ زیادہ سامان ہونے کی وجہ سے شاید اسے کوئی تکلیف ہوئی ہو ۔ رابرٹ نے خوش اخلاقی سے انہیں یقین دلایا کہ اُسے مطلقاً کوئی تکلیف نہیں ہوئی ، اور حقیقت میں وہ بڑے آرام میں ھے ۔ اس تعارف کے بعد پرنس سمرقندی کے رابرٹ لانگ کو کد کے ڈاک بنگلے میں اپنے ساتھ لنچ کھانے کے لئے مدعو کیا ۔ بیگم سمرقندی نے بھی تائید کی اور رابرٹ نے شکریہ کے ساتھ دعوت قبول کر لی ۔

جموں شہر سے نکل کر جب گاڑی مہاراجہ بہادر کے موسم سرما کے محلات کے قریب پہنچی، تو پرنس سمرقندی نے ڈرائیور کو حکم دیا، کہ تعظیماً اس مقام پر گاڑی کی رفتار بہت کم ہونی چاہئے - جب تک گاڑی محلات کے سامنے سے گزرتی رہی، پرنس سمرقندی اپنی فیلٹ ہیٹ ہاتھ میں لئے مؤدبانہ بیٹھے رہے - بیگم سمرقندی نے بڑے شوق سے لولو کو سرکار کے بیٹھنے، کھانے، اور سونے کے کمروں کی کھڑکیاں دکھائیں - کشمیری پنڈت پروفیسر صاحب نے رومال منہ کے سامنے کر کے پرنس سمرقندی کے اس اظہار وفاداری پر خوب ناک چڑھائی، اور کہنی مار کر اپنی بیوی کو بھی یہ تماشا دیکھنے کی تلقین کی - لیکن بیچاری پنڈتانی یہ منظر نہ دیکھ سکی، کیونکہ وہ اپنے فرن کے گریبان میں منہ ڈال کر کانگڑی میں بڑی شدت کے ساتھ قے کرنے میں مصروف تھی -

جموں سے ادھم پور تک بے آب و گیاہ پہاڑوں کا سلسلہ کوہ تھا - نہ زیادہ چڑھائی تھی، نہ اترائی - لیکن سڑک بڑی پیچیدہ اور گنگھریالے بالوں کی طرح بل کھاتی ہوئی تھی - کہیں کہیں بکریاں پہاڑ کی ڈھلوان پر جھاڑیاں چرتی ہوئی نظر آتی تھیں - کہیں کہیں اچانک کوئی پہاڑی جھرنا آ جاتا تھا - چھوٹے چھوٹے دیہاتوں پر چٹانوں ایسا جمود چھایا ہوا تھا - کھیتوں میں خونخوار صورت اور بڑی بڑی مونچھوں والے ڈوگرے بیٹھے چلم پی رہے تھے - یا اپنے جوتے ہاتھوں میں اٹھائے ننگے پاؤں مٹر گشتی میں مصروف تھے - کبھی کبھی

کسی پگڈنڈی یا موڑ پر اچانک کوئی ڈوگری آ جاتی تھی، تو فضا میں ایک بجلی سی کوند جاتی تھی - لانبے لانبے قد - رنگ برنگے چست کرتے - سڈول ٹانگوں پر سانس کی طرح بل لہراتے ہوئے چوڑیدار پاجامے - قوس قزح کی طرح فضا میں لہراتی ہوئی رنگین چنریاں - گورا گورا رنگ - تیز تیز عقابی آنکھیں - اس حسن میں ایک عجیب جلال تھا - سر پر دودھ کی مٹکیاں یا لکڑی کے گٹھے اٹھائے جب یہ ڈوگریاں مستانہ چال سے پہاڑی پگڈنڈیوں پر چلتی تھی، تو فضا میں ایک ارتعاش سا چھا جاتا تھا - پرنس سمرقندی بڑی فصاحت اور بلاغت سے ڈوگرہ نسل کی فضیلت پر تبصرہ کر رہے تھے - کیونکہ حضور مہاراجہ بہادر بھی اسی نسل کے چشم و چراغ تھے - "صاحب مہربان - یہ سمجھ لو، کہ دنیا میں بس دو خاندانوں کا خون اب تک ناپاک نہیں ہوا - ایک تو سرکار کا خاندان مبارک ہے - اور صاحب مہربان دوسرا خاندان شاہزادگان سمرقندی کا ہے - ڈوگرہ نسل گنگا جل کی طرح پوتر ہے - اور صاحب مہربان، شاہزادگان سمرقندی کا خون آب زمزم کی طرح مصفا ہے - - -"

پرنس عبدالرحیم سمرقندی نے جموں شہر سے نکلتے ہی اپنے ہینڈ بیگ سے کاک ٹیل شیکر، جن، بٹرز، اور سنتروں کی بوتلیں نکال لی تھیں - اور خانم سمرقندی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اپنے سرتاج کو لذیذ سے لذیذ کاک ٹیل تیار کر کے پیش کر رہی تھی - پرنس سمرقندی بڑی فصاحت سے سرکار کے شکار کے

شوق کی داستانیں سنا رہے تھے ۔ جب انہوں نے سرکار کے لئے سور، شیر، چیتے اور ریچھ کے شکار کے لاجواب انتظامات کئے تھے ۔ کوئی آدھی درجن نوش جان فرما کے پرنس سمرقندی نے سرکار کو چھوڑ کر لولو کی طرف رجوع کیا، جو بیزاری کے عالم میں بیٹھی مہاراجہ کے شکار کی تفصیلات اور خانم سمرقندی سے مہاراجہ کے محلات کے مختلف کمروں کی کارسکیم فرنیچر، قالینوں اور پردوں کے حالات سن رہی تھی ۔ نشے کی ترنگ میں آ کر پرنس سمرقندی نے لولو کے دائیں رخسار کے تل پر انگلی رکھ کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بڑی رقت سے فرمایا ۔ "صاحب مہربان، اس دل آویز تل کی کیا بات ہے ۔ لولو میری جان، ہمارے آبا و اجداد نے تمہارے اس خال پر سمرقند اور بخارا کی پادشاہی قربان کر دی تھی ۔ ہائے ! صاحب مہربان ۔ بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را !"

لولو نے غصے سے پرنس سمرقندی کا ہاتھ ایک طرف جھٹک دیا، اور احتجاجاً ان کی بیوی کی طرف دیکھا ۔ خانم مسکرانے لگی ۔ "لولو، تو ان کی باتوں کا خیال نہ کر ۔ یہ تو تیرے باپ کی جگہ ہیں ۔ ایسے ہی مذاق کرنا تو ان کی عادت ہے ۔ سرکار کو ان کا مذاق بہت پسند ہے ۔ ایک روز انہوں نے سرکار کے سامنے ہزہائنس کو چوم لیا تھا ۔ پیلس میں بڑا شور ہوا ۔ لیکن سرکار نے کہا کوئی بات نہیں ۔ پرنس سمرقندی تو مہارانی کا بھائی ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن لولو پر ان دلائل نے کچھ اثر نہ کیا ۔ پرنس سمرقندی



اب اس کے رخسار کے تل سے ہٹ کر اس کی کمر کی گولائی ناپنے پر اتر آئے تھے۔ اور اس عمل میں بار بار اسے اپنی گود میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بر سر عام یہ اظہار عشق دیکھ کر لولو کا منہ غصہ سے لال ہو گیا۔ اس نے ہاتھ گھما کر پرنس سمرقندی کے منہ پر ایک زناٹے کا طمانچہ رسید کیا، اور " اوہ یو ڈیم سوائن " کہتی ہوئی ان کے پاس سے اٹھ کر دوسری سیٹ پر آ بیٹھی۔

لولو کے طمانچے نے پرنس سمرقندی پر خاطر خواہ اثر کیا۔ یکے بعد دیگرے دو اور کاک ٹیل اپنے گلے میں انڈیل کر وہ اپنی خانم کے ساتھ لپٹ گئے، اور اس کی گردن پر منہ رکھ کے بے اختیار رونے لگے۔ خانم بڑی شفقت سے اس کا سر سہلانے لگی۔ اور رفتہ رفتہ ہچکیوں کے درمیان پرنس سمرقندی ایک معصوم بچے کی طرح سو گئے۔ خانم نے ان کا سر بڑھی احتیاط سے اپنی گردن سے اٹھا کر اپنے زانوؤں پر رکھ دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پرنس سمرقندی اس گداز مخملیں تکیے پر لیٹے لیٹے خراٹے لینے لگے۔ خراٹوں کی شدت سے پرنس سمرقندی کا جھریوں زدہ چہرہ ایک پرانے فٹ بال کی طرح پھیلتا اور سکڑتا تھا، جس میں بڑی کوشش سے ہوا بھری جائے لیکن وہ ہر بار نکل جائے۔ رخساروں اور ہونٹوں کے اس زیر و بم کے ساتھ ان کے مصنوعی دانتوں کا جبڑا بھی ڈھیلا ہو گیا تھا۔ اور ہر خراٹے کے ساتھ یہ احساس ہوتا تھا، کہ وہ کھٹاک سے باہر آ پڑیگا۔ خانم سمرقندی نے اپنے ریشمی دوپٹے کا پلو

اپنے سرتاج کے چہرے پر ڈال دیا۔ اور پھر ملامت سے پر آنکھوں سے لولو کی طرف دیکھا۔

لولو سیٹ کے کنارے یوں بیٹھی تھی، جیسے خطرہ کا اشارہ پاتے ہی اٹھ کر بھاگنے پر آمادہ ہو۔ غصے سے اس کا چہرہ تنا ہوا تھا، اور اس کے رنگ کی قدرتی پیلاہٹ میں اب ایک ہلکی قرمزی جھلک بھی نمایاں تھی۔ خانم سمرقندی کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر لولو نے خود ہی پیشقدمی کی۔ "مجھے افسوس ہے، آنٹی۔ لیکن میں سرینگر نہیں جانا چاہتی۔ میں کد سے کسی بس پر واپس آ جاؤنگی۔"

لولو کا یہ عزم سن کر خانم سمرقندی کی آنکھوں سے ملامت کی خشونت یوں غائب ہو گئی جیسے ابلتی ہوئی ہنڈیا کی بھاپ ہوا میں آ کر یکایک تحلیل ہو جاتی ہے۔ ملامت کی جگہ اب اس کی آنکھوں میں لجاجت، خوشامد اور عاجزی کے موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ وہ جلدی سے اٹھی، کہ لولو کو گلے سے لگالے۔ اس عمل میں اسے اپنے سرتاج کا بھی خیال نہ رہا جو اس کے زانوؤں کے تکیے پر سر ٹکائے مزے سے پڑا سو رہا تھا۔ بیگم سمرقندی جب سرعت سے اٹھی، تو پرنس سمرقندی کا سر تربوز کی طرح ہوا میں اچھل کر پہلے سیٹ کے گدے پر گرا، اور پھر rebound کر کے سیٹ کی چوبی پشت کے ساتھ کٹاک سے ٹکرایا۔ لیکن بیگم سمرقندی کے مشاق ہاتھوں کے بنائے ہوئے آٹھ کاک ٹیلز کا نشہ اتنا کچا نہ تھا، کہ اس معمولی سے جھٹکے سے ٹوٹ جاتا۔

"میری پیاری لولو جان" بیگم سمرقندی نے لولو کو گلے سے

لگا کر کہا۔ ”تم اتنی سی بات پر بگڑ گئیں۔ لو، تم میرے منہ پر جتنے طمانچے جی چاہے مار لو۔“

بیگم سمرقندی نے اپنے گالوں کے قندھاری انار لولو کے سامنے جھکا دئیے۔ لیکن یہ پیشکش بھی لولو کے غصہ کو ٹھنڈا نہ کر سکی۔

”میری جان لولو۔“ بیگم سمرقندی نے اب اپنی آواز میں رقت پیدا کر کے کہا۔ ”تم نے اس درویش کی بات کا برا منا لیا؟ دیکھو تو میرا فقیر کس طرح ایک بے ضرر خرگوش کی طرح سویا پڑا ہے۔ میں نے پورے پچیس سال اس کے ساتھ گزارے ہیں۔ خدا کی قسم، اس میں عورت کو ضرر پہنچانے کا مادہ ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر بیگم سمرقندی نے لولو کو معنی خیز انداز سے جھنجھوڑا، اور اپنا چنار ایسا maieshi جسم تان کر جھرجھری سی لی۔ اپنے خاوند کی معصومیت کا یہ دعویٰ کچھ جھوٹا نہ تھا۔ کیونکہ پچیس سالہ ازدواجی زندگی کے باوجود پرنس سمرقندی اپنے آبا و اجداد کی شاہی نسل برقرار رکھنے کے لئے کوئی صورت پیدا نہ کر سکے تھے۔ یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ ہندوستانی ریاستوں کے لئے ولی عہد فراہم کرنے والا پرنس سمرقندی خود اس نعمت سے محروم تھا۔

پرنس سمرقندی کی جسمانی اور جنسی صلاحیتوں کی تفصیلات نے بھی لولو کے دل کو نرم نہ کیا۔ وہ بدستور منہ پھلائے بیٹھی رہی، اور کد سے کسی بس پر واپس لوٹ آنے کا دوبارہ اعلان کیا۔

لولو کی اس ضد نے خانم سمرقندی کے اعصاب کو شل کر دیا ۔ اس کے جسم کے شاندار چنار پر پت جھڑ کی سی بے رونقی چھا گئی ۔ آنکھوں کے بڑے بڑے پیالوں میں آنسو چھلک آئے۔ اور خانم سمرقندی کو اپنے شاہی خاندان کا مستقبل بڑا تاریک نظر آنے لگا ۔ کیا کیا جتن کر کے انہوں نے لولو کو سرکار کا مہمان بننے پر آمادہ کیا تھا ۔ اب اگر وہ راستے ھی میں واپس لوٹ گئی ، تو وہ سرینگر جا کر سرکار کو کیا منہ دکھائینگے۔ اپنے خطوط میں انہوں نے لولو کی دلاویز رعنائی، اس کے چھریرے بدن کی نزاکت اور اس کے کندن کی طرح دمکتے ہوئے رنگ کو نئے نئے زاویوں سے پیش کیا تھا ۔ اور اب سرکار بڑی شدت سے اس کی آمد کا انتظار فرما رہے ہونگے۔ اگر لولو سرینگر نہ گئی تو شاہان سمرقند کی تاریخی ناک کٹ جائیگی۔ اور پرنس سمرقندی اور ان کی خانم کے چہروں پر کالک لگ جائیگی ۔ اور راج دربار میں ان کے رتبۂ عالی کو بڑا صدمہ پہنچیگا ۔ راج دربار کا دستور تھا ، کہ ہر سال بہار کے موسم میں سرکار کے مقربین خاص بڑی جستجو کے بعد مہاراجہ بہادر کے لئے حسین و جمیل مہمان لایا کرتے تھے ۔ حضور مہاراجہ بہادر کی ذات مبارک تو افلاطونی عشق کی اس منزل پر پہنچ چکی تھی ، جسے مرزا غالب نے یوں ادا کیا ھے :

گر ھاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ھے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے!

چنانچہ جنسی لحاظ سے ان مہمانوں پر تذکیر و تانیث کی کوئی قید نہ تھی ۔ جسے ساغر ملتا تھا ، وہ ساغر لے آتا تھا ۔

جیسے مینا میسر ہوتی تھی ، وہ مینا حاضر کرتا تھا ۔ پچھلے ستائیس برس سے پرنس سمرقندی بڑی باقاعدگی سے ساغر و مینا کے اس کاروبار میں بڑھ چڑھ کے حصہ لے رہے تھے ۔ سرکار کو ان کے حسن معاملہ پر بڑا بھروسہ تھا ۔ اس وجہ سے دوسرے درباری دل ہی دل میں پرنس سمرقندی اور خانم سمرقندی کے خلاف بہت کڑھتے تھے ۔ اب اگر وہ لولو کے بغیر سرینگر پہنچے تو ستائیس برس کے بے داغ اور شاندار ریکارڈ کے بعد ان کی یہ پہلی شکست ہوگی ۔ ۔ ۔

خانم سمرقندی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپک رہے تھے ، جو اس کے سلکی بلاؤز پر پھیل پھیل کر جذب ہو جاتے تھے ۔ لولو بدستور غصے کے جوش سے کمان کی طرح تنی بیٹھی رہی ۔

"مجھے افسوس ہے ، آنٹی ۔ میرا ذرہ بھر بھی ارادہ نہیں کہ آپ کو کوئی رنج پہنچے ۔ لیکن میں آگے نہیں جاسکتی ۔ مجھے کد سے واپس آنا ہی ہوگا ۔"

"لولو ، میری جان ۔ تم بہت غصے میں ہو ۔ اس وقت تم میری کوئی بات نہ مانو گی ۔ میری درویش کو اٹھنے دو ۔ وہ تمہیں ضرور منا لیگا ۔ میرا فقیر سب کو منا لیتا ہے ۔ لولو میری جان ، دیکھو اب چڑھائی شروع ہو گئی ہے ۔ یہ لو ، ایک فروٹ ڈراپ چوس لو ۔ تمہاری طبیعت بشاش رہیگی ۔" خانم سمرقندی نے اپنے پرس سے ایک لیمن ڈراپ نکال کر لولو کو دیا ۔ اور پھر آئینہ دیکھ کر اپنے چہرے پر مخملی پھر کے سے پوڈر کیا ۔

ادھم پور کے بعد بانہال روڈ کی چڑھائی شروع ہو گئی تھی - پیچ در پیچ چکر کھاتی ہوئی سڑک مہیب پہاڑ کے کے گرد ایک سیاہ اژدھے کی طرح لپٹی ہوئی جا رہی تھی - کشمیری پروفیسر کی پنڈتانی بیوی کا جی اب اور بھی متلانے لگا تھا - پروفیسر صاحب خود ھمہ تن گوش بنے بیٹھے تھے اور پرنس سمرقندی ، خانم اور لولو کے ڈرامے کا ھر لفظ اور ھر سین بڑی محنت سے ذھن نشین کر رھا تھا - پے درپے چکروں کی وجہ سے رابرٹ لانگ کا جی بھی کچا ہونے لگا تھا- اور وہ سیٹ پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کئے آرام کرنے کی کوشش کر رھا تھا -

کوئی ایک بجے کے قریب جب اسٹیشن ویگن کد کے ڈاک بنگلے کے سامنے جا کر رکی ، تو خانم سمرقندی کا معصوم درویش بھی اپنے مراقبے سے بیدار ھو چکا تھا - کاک ٹیلز کا سرور ایک آندھی کی طرح گزر چکا تھا ، اور پرنس سمرقندی اپنی پشتہا پشت کی دربار داری کے آداب جمع کر کے لولو کی خوشامد میں لگے ہوئے تھے - ان کی زبان کی مٹھاس میں بہت سی ریاستوں کے تخت اور تاج اپنے تاجداروں سمیت ایک مکھی کی طرح بے دست و پا گرفتار تھے - بیچاری لولو کی کیا مجال تھی ، کہ ان کے سحر سے بچ نکلتی - چنانچہ ، جب پرنس سمرقندی اپنی خانم ، لولو اور رابرٹ لانگ کے ساتھ ڈاک بنگلے میں لنچ پر بیٹھے ، تو ساری رنجشیں بیئر کے جھاگ دار گلاسوں میں ڈوب کر مٹ چکی تھیں ، اور مچھلی ، مرغ ، پلاؤ ، کوفتے ، اور بلائی دار سویؤں کے ھر کورس کے ساتھ دوستی اور وفاداری کا

ایک نیا باب کھل رہا تھا۔

لنچ کے بعد قیلولہ کا اہتمام تھا۔ پرنس سمرقندی اور خانم لباس شب خوابی زیب تن کر کے ایک کمرے میں چلے گئے۔ لولو نے برآمدے میں ایک آرام کرسی کو انتخاب کیا۔ اور رابرٹ لانگ کو نظام دین سقے کی جستجو ہوئی، جو اس ڈاک بنگلے میں پانی لایا کرتا تھا۔ اس نے ڈاک بنگلے کے بیرے سے نظام دین کے گھر کا پتہ پوچھا۔

بیرا رابرٹ لانگ کی معلومات کی وسعت اور اس کے انتخاب کی صحت پر مسکرایا۔ "صاحب، اس کی ٹانگ میں پھوڑا نکلا ہوا ہے۔ دس بارہ روز سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے۔ اور ڈاک بنگلہ میں پانی نہیں لاتا۔"

"کوئی بات نہیں۔" رابرٹ لانگ نے کہا۔ "تم مجھے اس کے گھر کا پتہ بتادو۔ میں خود اسے دیکھنے جاؤں گا۔"

بیرے نے سر ہلا کر مایوسی کا اظہار کیا۔ "کوئی فائدہ نہیں صاحب۔ اس کے پاس بڑا اچھا دانہ ہے، لیکن وہ اسے ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔ وزیر وزارت صاحب، پولیس کپتان صاحب، تحصیلدار صاحب، تھانیدار صاحب سب کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے بھی آپ جیسے صاحب لوگوں کے لئے بڑے بڑے جتن کئے ہیں۔ لیکن وہ حرامی نظام دین کسی طرح قابو میں نہیں آتا۔ اس کے پاس جانے سے کوئی فائدہ نہیں، صاحب۔" اس اطلاع کے بعد بیرے نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر صاحب کا جی چاہتا ہے، تو وہ دس منٹ میں خیراتئی تیلی کی سترہ سالہ لڑکی لا سکتا ہے۔ شکل و صورت میں کسی طرح

وہ نظام دین کی جمیلہ سے کم نہیں ۔ اس کا خاص طرہ امتیاز یہ تھا ، کہ ایک روز جب سرکار یہاں سے گزر رہے تھے ، تو ان کی نظر خیرائتی تیلی کی بیٹی پر پڑی جو ایک پتلی سی چادر اوڑھے نشیبی چشمے پر بیٹھی نہا رہی تھی ۔ سرکار نے اپنی موٹر روکی ، اور مووی کیمرا نکال کر اس کے بہت سے فوٹو لئے ۔ ۔ ۔ ۔

رابرٹ لانگ نے بڑی کوشش سے بیرے کو یقین دلایا ، کہ اس کو خیرائتی تیلی کی بیٹی اور اس کے خاص اعزازات سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔ البتہ وہ نظام دین بہشتی سے ملنا چاہتا ہے ۔ کیا بیرا اس کی مدد کر سکتا ہے ؟

بیرے نے طوعاً و کرھاً خیرائتی تیلی کی بیٹی کا بیان چھوڑ کر رابرٹ لانگ کی طرف مایوسی سے دیکھا ۔ جو اس رنگین اور گداز حقیقت کو چھوڑ کر خواہ مخواہ نظام دین کا کھمبا نوچنے چلا تھا ۔ خیر ، اس نے باورچی خانے سے ایک چھوکرے کو بلا کر رابرٹ لانگ کے ساتھ کر دیا ، کہ وہ اسے نظام دین سقے کے گھر لیجائے ۔

پہاڑی پگڈنڈیاں چڑھتے چڑھتے رابرٹ لانگ کا سانس پھول گیا ۔ لیکن ان کا رہنما لڑکا ایک سبکسار گلہری کی طرح بھاگتا ، پھلانگتا ، پھلتا بڑھتا گیا ۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر جا بجا خوشنما کوٹھیاں سانپ کی چھتریوں کی طرح ایستادہ تھیں ۔ کہیں کہیں جھرنوں کا سرود تھا ۔ کسی جگہ ناشپتی کے درختوں سے جھولے بھی لٹک رہے تھے ۔ کوئی ڈیڑھ دو میل چل کر چیڑ کے گنجان درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ جنگل

کی ھوا ان درختوں کے بیچ بڑی مہیب چیخیں مارتی ھوئی گزرتی تھی۔ ان چیخوں کے علاوہ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ اور اس سناٹے میں نظام دین سقے کی جھونپڑی واقعہ تھی۔ نظام دین اپنی جھونپڑی کے آگے ایک کھاٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے پھوڑے والی دائیں ٹانگ کھول کر دھوپ میں پھیلائی ھوئی تھی۔ اور ھاتھوں سے پہاڑی سن ککڑے کی رسیاں بنا رھا تھا۔ ڈاک بنگلے کے چھوکرے کے ساتھ ایک گورے صاحب کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا، اور حفظ ماتقدم کے طور پر وہ اپنے لاٹھی کا سہارا لیکر کھڑا ھو گیا۔

"خبردار۔" نظام دین نے ڈاک بنگلے والے چھوکرے کو ڈانٹ کر للکارا۔ "تم اپنی ماں کے خصم کو کہاں لا رھے ھو؟ میں تم دونوں حرامزادوں کی گردن کاٹ دونگا۔"

رابرٹ لانگ نے اپنی امن پسندی کے اظہار میں اپنا سفید رومال ھوا میں لہرایا۔

"تم یہ رومال اپنی ماں کو دکھاؤ۔" نظام دین غصے سے پاگل ھو کر چلایا۔ "یہ رومال اپنی بہن کو دو۔ یہاں کس سالی کے پاس آ رھے ھو۔ جاؤ۔ خبردار، میں جان سے مار ڈالونگا۔"

ایک چھوٹا سا پتھر سنسناتا ھوا آیا اور ڈاک بنگلے کے کے چھوکرے کے ننگے سر پر کھٹاک سے لگا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور نظام دین کو گالیاں دینے اور رونے لگا۔ رابرٹ لانگ نے دیکھا، کہ نظام دین کے پیچھے ایک نو عمر لڑکی قمیص کی جھولی میں پتھر بھرے بپھری ھوئی شیرنی کی طرح کھڑی

تھی - بائیں ہاتھ سے اس نے جھولی تھامی ہوئی تھی ، اور دائیں ہاتھ سے وہ بڑی سرعت کے ساتھ پتھر نکال نکال کر رابرٹ لانگ کو نشانہ بنا رہی تھی۔ اس exertion کی وجہ سے اس کے گال تمتما رہے تھے - اور اس کے پریشان بالوں کی ایک لٹ غصیلی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی تھی - رابرٹ لانگ پچھلی جنگ میں کئی محاذوں کا دورہ کر چکا تھا - اور گولیوں کی بوچھاڑ میں اسے آگے بڑھنے کی کافی مشق تھی ! چنانچہ اس نے اپنی ہیٹ کو ڈھال کی طرح سامنے کر کے سر جھکا لیا اور تیز تیز قلانچیں بھرتا ہوا نظام دین کے پاس پہنچ گیا - جمیلہ سفیدے کے نازک بوٹے کی طرح کانپنے لگی۔ پتھروں کی جھولی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی - اور وہ ایک زخم خوردہ ہرنی کی طرح دردناک چیخیں مارتی جھونپڑے میں بھاگ گئی - نظام دین نے اپنی لاٹھی ہوا میں گھما کر رابرٹ لانگ پر وار کرنا چاہا۔ لیکن اس کی پھوڑے والی زخمی ٹانگ نے اس کا ساتھ نہ دیا ، اور وہ تیورا کر چارپائی پر گر گیا - اس بے بسی کی حالت میں اس نے بھی وہی کیا جو ہر بے بس انسان کیا کرتا ہے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔

پٹیالہ پیگ

شام کی سیاہی پھیلتے ہی دور ساحل پر روشنی کے ننھے ننھے سے نشان ابھرنے لگے۔ ایس۔ ایس۔ سدرتھ سور جو اٹھارہ دنوں سے برابر ایک قوی ہیکل دیو کی طرح سمندر کا سینہ چیرتا آ رہا تھا، اب منزل کو قریب پا کر آسودہ خرامی پر اتر آیا۔ موجوں کے طوفانی تھپیڑے جو سمندر کی وسیع بیکرانی میں جہاز کو ایک تنکے کی طرح مارے مارے پھرتے تھے، رفتہ رفتہ مدھم پڑنے لگے۔ اور ان کی تندی، تیزی اور ابھار ہر ایک بے جان سا سکون چھانے لگا جو منزل کو پا کر ہر آرزو پر چھا جاتا ہے۔

وہ روشنی جو سب سے نمایاں ہے، شاید مالابار ہل پر ہوگی۔ نہیں، مالابار ہل پر اتنی تیز روشنی کہاں سے آئی۔ یہ تو تاج محل ہوٹل ہے۔ ہاں، ممکن ہے۔ لیکن شاید یہ میجسٹک

ہو؟ نان سنس! یہ گورنمنٹ ہاؤس کا بلب ہے۔ کیا عجب کہ یہ کانگرس بھون ہو؟ یا محمد علی جناح حال ہو؟ یا کمیونسٹ پارٹی کا دفتر؟ اور وہ نورانی لکیر جو دائیں طرف کہکشاں کی طرح کھنچی چلی گئی ہے، ضرور میرین ڈرائیو پر قمقموں کی جگمگاہٹ ہے۔ رات کے اندھیرے میں وہ یوں نظر آتی ہے، جیسے سلمیٰ کے کالے اور گھنے بالوں کی مانگ میں افشاں بھری ہوئی ہو۔ جیسے پاربتی بائی طلے دار کالی ساڑھی پہنے چھما چھم ناچ رہی ہو، اور اس کے سینے پر دمکتے ہوئے سطح اور ستاروں کا ہجوم نورانی لہروں کی طرح جھلملا رہا ہو۔ جیسے ہلڈا بیدنگ کاسچوم پہنے بیچ پر لیٹی ہوئی ہو، اور اپنے مرمریں شانوں اور سینے کو کمان کی مانند تان کر قوس قزح سی انگڑائی لے رہی ہو۔۔۔۔ ڈیک پر مسافروں کا ہجوم گردنیں اٹھا اٹھا کر، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر، ساحل کے ابھرتے ہوئے نشانوں کا عید کے چاند کی طرح انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دوربینیں لگائے کھڑے تھے۔ کچھ دل کی آنکھیں وا کئے ہوئے تھے۔ اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں روشنی کا ہر نشان اور ساحل کی جانب زندگی کا ہر آثار ان کے رگ و پے میں برقی جھٹکوں کی طرح اثر انداز ہوتا تھا۔ پورٹس ماؤتھ سے لنگر اٹھانے کے بعد اٹھارہ دن سے برابر یہ ساڑھے بارہ سو کالے، گورے، پیلے، بھورے مرد، عورتیں اور بچے ایک خوشحال قبیلے کی طرح ایک ساتھ رہ رہے تھے۔ ڈائننگ روم میں وہ اکھٹے کھانے پر بیٹھتے تھے۔ بار روم میں سیاسیات، فلسفہ، ادب، جنسیات پر دلچسپ مباحثے ہوتے تھے۔ کبھی سومنگ پول میں تیرنے

کے مقابلے ۔ کبھی ڈیگ ٹینس کے میچ ۔ فینسی ڈریس بال ۔ بچوں کی دوڑیں ۔ برج ۔ فلیش ۔ کانسرٹ ۔ اور کبھی کبھی کیبنوں کے آس پاس یا ڈیکوں کے خاموش کونوں میں یا چمنیوں کی اوٹ میں دوزدیدہ رومانوں کے مختصر لمحات ۔ اتنے مختلف لوگوں کو اتنے دن ایکدوسرے سے اسقدر قریب رہنے کا موقع بہت کم نصیب ہوا تھا ۔ اور اس احساس میں بھی ایک عجیب یگانگت کا جذبہ تھا ، کہ اگر وہ ڈوبیں گے تو بھی ایک ساتھ ، اور منزل تک پہنچیں گے ، تو بھی ایک ساتھ ۔ اگرچہ ایس ایس میڑتھ مور میں ڈوبنے کا امکان پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ۔ لیکن سفر میں دلچسپی اور adventure چاشنی بھرنے کے لئے ، بہت سی عورتیں اور بہت سے مرد دل ہی دل میں اس خطرناک امکان کو زندہ رکھنے پر مصر تھے ۔ اور لائن بیلٹ کی پریکٹس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ منصوبے بھی گانٹھ رکھے تھے ، کہ اگر کسی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر جہاز پاش پاش ہو جائے ، تو وہ کس کس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ڈوبنا پسند کرینگے ۔

جیسے جیسے بمبئی کی منزل قریب آتی گئی ، سمندر کی بے پناہ لہروں کے طوفان دھیمے پڑتے گئے ۔ اس کے ساتھ ساتھ مسافروں کی برادری میں بھی کہیں کہیں انانیت ، کہیں انفرادیت کہیں رنگ ، کہیں نسل ، کہیں مذہب کے امتیازات سر اٹھانے لگے ۔ جان میکفرسن جو طویل رخصت سے واپس آنے کے بعد صوبہ بہار میں بھاگلپور کی کمشنری کا چارج لینے والا تھا اب کچھ دنوں سے باقیوں سے الگ تھلگ رہنے لگا تھا ۔ اور

صرف اب اس نے بار میں سیاسی مباحثوں سوئمنگ پول میں ڈائیونگ اور فینسی بال میں پوسٹ مین بننے کے مشاغل ترک کردئے تھے۔ اور کھلے کالر کا قمیص اور خاکی نکر چھوڑ کر اب باقاعدہ سوٹ پہننا شروع کر دیا تھا۔ مسز جیکسن نے کیبن بوائے کو پلیز اور بٹلر کو تھینک یو کہنا بند کر دیا۔ کیونکہ اب اس کی مملکت قریب آرہی تھی جس میں اس کا خاوند ایک پورے ضلع کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس ضلع کی آبادی ناروے کی آبادی کے برابر اور رقبہ ڈنمارک کے ملک سے زیادہ تھا۔ یہ اعداد شمار مسز جیکسن کے نوک زبان تھے اور وہ انہیں برمنگھم اور لنکا شائر کے کارخانوں میں کام کرنے والی چچیوں، خالاؤں اور بہنوں کو سنا سنا کر حیران و پریشان کر دیا کرتی تھی۔ کل شام سے سردار جسونت سنگھ بھی نہ بار میں آیا تھا، نہ برج پر، نہ فشنگ میں اور نہ ہی اس نے ڈنر کے بعد ماہیا کے دردناک دوہے گا گا کر ہندوستانی میموں کو رلانے اور گوری میموں کو ہنسانے کی کوشش کی تھی۔ یگانگت اور انسانیت کا خول جو سمندر کی وسعتوں نے جہاز کے مسافروں پر چڑھا دیا تھا، اب ان وسعتوں کو عبور کرنے کے بعد برف کے تودے کی طرح پگھلتا جا رہا تھا اور جب سر شام دور ساحل پر روشنی کے نشان ابھرنے لگے، تو ہر مسافر کا دائرہ انسانیت محدود ہو کر اجنبیت اور منافرت کے اسی نکتے پر آ گیا، جس پر وہ پورٹس ماؤتھ سے روانہ ہوئے تھے۔ بیچ سمندر کے راز سمندر ہی میں ڈوب گئے اور ساحل کی آنکھ کبھی ان سے آشنا نہ ہو سکے گی۔

ڈیک پر ایک نفسا نفسی کا عالم تھا ۔ ہر شخص کی خواہش تھی ، کہ ساحل پر جو نئی روشنی جھلملائے اس پر سب سے پہلے اسی کی نظر پڑے ۔ اور ہر روشنی کے ساتھ دلوں میں تصورات کی ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی تھی ۔ کسی کو اس میں مالابار ہل نظر آتا تھا ۔ کسی کو تاج محل ہوٹل یا میجسٹک ۔ یا گورنمنٹ ہاؤس ۔ یا کانگرس بھون ۔ یا محمد علی جناح ہال ۔ یا کمیونسٹ پارٹی کا دفتر ۔ یا نجمہ کی مانگ میں افشاں ۔ یا دل افروز بائی کے سینے پر جھلملاتے ہوئے سلمے اور ستارے ۔ یا ہلڈا کے جسم کے کہکشانی عکوس ۔ ۔ ۔ ۔

جان میکفرسن سوچ رہا تھا ۔ کہ اگر بھاگپور کی کمشنری کا ناظر اور ہیڈ اردلی اس کی پیشوائی کے لئے بمبئی نہ پہنچے ہوئے ، تو آئی ۔ سی ۔ ایس کی بائیس سالہ ملازمت میں یہ اس کے دل پر تیسرا چرکا ہوگا ۔ پہلا چرکا اس کے دیرینہ خادم افضل کے ہاتھوں لگا تھا ۔ افضل کوئی سولہ برس سے اس کا بیرا تھا ۔ جس طرح جان میکفرسن کو آئی ۔ سی ۔ ایس کی ملازمت میں ایک بے تاج قسم کی بادشاہی کا چسکا پڑ گیا تھا اسی طرح افضل کو بھی سفید آقاؤں کی خدمت کی چاٹ تھی ۔ یہ شوق اسے سینہ بسینہ اپنے دادا سے وراثت میں ملا تھا ۔ اور کمپنی بہادر کے زمانے سے اس خاندان کے کسی فرد نے انگریزوں کے سوا کسی ہندوستانی گھرانے میں خدمت گذاری کی ذلت برداشت نہیں کی تھی ۔ اسی وجہ سے افضل کے ضمیر میں ایک ایسی دوغلی سرشت کی آمیزش تھی ، جو اسے بیروں

اور خانساماؤں کی عام برادری سے کچھ درجہ ممتاز اور ہندوستانی عیسائیوں کے نچلے طبقہ کے ساتھ کسی حد تک ہمدوش کرتی تھی ۔ چنانچہ وہ لباس میں قمیص ، پتلون اور نیلے کمر بند والی سفید اچکن کا نہایت شدت سے پابند تھا اور زبان میں چرچ مشنری سوسائٹی کے پادریوں ایسی انگریزی نما اُردو استعمال کرتا تھا ۔ یہ سلیقہ اس نے ابتدا میں محض فیشن کے طور پر اختیار کیا تھا ۔ لیکن امتداد زمانہ نے اسے اس کی فطرت کا ایک جزو بنا دیا ۔ یہاں تک جوں جوں اس کے آقا جان میکفرسن کی اُردو منجھتی اور سنورتی گئی ، افضل کی زبان اپنے مرکز سے پھسل کر عجیب و غریب تراکیب ، بندشوں ، اور اسالیب کی دلدل میں پھنستی گئی ۔ یوں تو جان میکفرسن ہر چوتھے پانچویں سال باقاعدگی سے طویل رخصت پر انگلستان جایا کرتا تھا ۔ لیکن اس بار جب وہ روانہ ہونے لگا ، تو بہت کچھ ہچکچاہٹ اور تشویش کے بعد افضل نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا ۔ ” صاحب ، اگر آپ گسہ نہیں کھاتا ، تو ہم کچھ بولنا مانگتا ۔ “

” ہاں ، افضل ، تم بولنے سکتا ۔ مگر یاد رکھو ہم بلایت سے تم کے واسطے اوور کوٹ نہیں لانا سکتا ۔ ادھر یہ جنس باہوت کمتی اور باہوت مہنگا ملتا ۔ “

” اوور کوٹ کا بات نہیں ، صاب ۔ “

” ہم سمجھتا ہے کہ جنگ ختم ہو گیا ہے ۔ لیکن ابھی تک بلایت میں شاید سگرٹ لائٹر آسانی سے ملنے نہیں مانگتا ۔ ورنہ ہم تمہارا یہ پورانا خواہش پورا کرتا تھا ۔ “

"پروا نہیں صاب۔ ہم اپنا ڈیمانڈ نہیں بولنا مانگتا۔"

جان میکفرسن نے کن انکھیوں سے افضل کی طرف دیکھا۔ ہر بار ولایت جاتے وقت افضل اسے اپنی فرمائشوں کی فہرست دیا کرتا تھا۔ جس میں مختلف النوع کی چیزیں شامل ہوتی تھیں۔ رسٹ واچ۔ سگرٹ کیس۔ اوور کوٹ۔ پرانے سوٹ۔ فونٹن پین۔ سیفٹی ریزر — اور ایک بار اس نے دبے لفظوں میں یہ خواہش بھی بیان کی تھی، کہ اگر ولایت میں تیس اور چالیس سال کی عمر والی کوئی میم صاحب خالی ہو، تو افضل برخار رغبت اسے قبول کرنے کے لئے تیار ہوگا۔ کیونکہ صاب، آپ جانتا ہے، کہ ہمارا کلچر اس کنٹری کے نیٹو لوگ سے بہت ہائی ہے۔ نیٹو عورت سے ہمارا گذر ہونا نہیں مانگتا۔ وہ ہمارا لینگویج نہیں سمجھتا۔ کانٹا چھری نہیں جانتا۔ کموڈ نہیں کرتا — ہم ان کے ساتھ سک ہوتا۔ صاب، ہم ان کے ساتھ مرجائیگا۔"

اس فرمائش پر جان میکفرسن نے اسے ذرا سختی سے ڈانٹ دیا تھا اور بڑی بے رحمی سے اس پر انکشاف کیا تھا، کہ ولایت کی میم صاحب افضل جیسے جاہل، غیر مہذب اور کمینے انسان پر لمبے سے لمبا پائپ لگا کر تھوکنا بھی پسند نہیں کریگی — آج افضل کی گفتگو سے اسے شک ہوا کہ کہیں اس کی یہ پرانی خواہش تو عود کر نہیں آئی؟ چنانچہ حفظ ماتقدم کے طور پر جان میکفرسن کی پیشانی پر تیوریوں کی بہت سے جھریاں نمودار ہو گئیں۔ افضل اپنے آقا کی رگ رگ کو خوب پہچانتا تھا۔ اس لئے وہ اس کے دل میں سر اٹھانے والے شبہات کو بھانپ گیا۔

"نہیں صاب۔ فکر نہیں۔ وہ بات بھی نہیں ہے۔"

"کون بات ؟"

"میم صاب والا بات ، صاب ۔ ہم اپنا پوزیشن خوب جانتا ھے، صاب ۔ ہم وہ خیال ڈسمس کر دیا ۔"

جان میکفرسن کے ماتھے کی جھریاں مدھم پڑ گئیں ۔ اور اس نے رومال نکال کر اس میں بڑے زور سے ناک صاف کی ۔

"صاب ، ہم یہ معلوم کرنا مانگتا کہ کیا اب صاب اس کنٹری میں واپس آئیگا؟"

جان میکفرسن کے تن بدن میں ایک زبردست جھٹکا لگا ۔ جیسے اس نے اچانک برقی رو کو چھو لیا ہو۔ اس نے رومال نکال اس میں اور بھی زور سے دوبارہ ناک صاف کی ۔

"صاب ، آج مارننگ جب ہم بازار کرنے گیا ، تو وہ وہ راسکل رام پرشاد فروٹ والا بولتا کہ مسٹر افضل ، اب تمہارا صاب واپس آنے نہیں سکتا ۔ ہم سب انگریز لوگ کو خلاص کرنا مانگتا ۔"

جان میکفرسن نے تیسری بار رومال نکال کر اپنے دماغ میں سراسرتے ہوئے بوجھ کو ہلکا کیا ۔ اگر رونا خلاف شان نہ ہوتا، تو یقیناً اس کی آنکھیں بھی اسی شدت سے اس کی ناک کا ساتھ دیتیں ۔

"صاب ، علی بخش بوچڑ بھی یہی ڈرٹی بات بولتا ۔ اور نرائن دھوبی بھی مسخری کرتا کہ مسٹر افضل اب برٹش راج ایکدم خلاص ہونا مانگتا ۔ صاب ، اگر بریک فاسٹ لیٹ نہیں ہوتا تھا ۔ تو ہم ان سب ڈیم سوائن کو باری باری سے مزا چکھاتا تھا۔ لیکن صاب صرف اپنا انفرمیشن کے واسطے ہم پوچھنا

مانگتا ، کہ کیا اب صاب اس کنٹری مین واپس آئیگا ؟

جان میکفرسن کے دل پر دوسرا چرکا لندن میں اس وقت لگا۔ جب وہ برکلے اسٹریٹ میں ٹامس کک کے ہاں ایس۔ ایس سیڑتھ مور میں اپنا برتھ ریزرو کروانے گیا تھا۔

''جان میکفرسن، اسکوائر۔ او۔ بی۔ ای۔ سی۔ آئی۔ ای۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ کمشنر، بھاگلپور۔ بہار۔ انڈیا۔'' رجسٹریشن سیکشن والی لڑکی اس کا پتہ لکھتے لکھتے اچانک رک گئی۔ اس نے رجسٹر پر جھکا ہوا سر اٹھا کر اپنے موٹے شیشے والی عینک کے پیچھے سے جان میکفرسن کی طرف یوں دیکھا، جیسے وہ اس کے پاس چاند کی طرف سفر کرنے کا ٹکٹ خریدنے آیا ہو پھر لڑکی کے لمبوترے سے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ اور اس نے ایک سرد آہ بھر کر جان میکفرسن پر دکھ اور رحم سے بھرپور نگاہ ڈالی۔

"going to collect your things, Sir?" لڑکی نے از راہ ہمدردی گفتگو کا آغاز کیا — اور جان میکفرسن کو کاؤنٹر کے سامنے کھڑے کھڑے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی چور چور ہو کر پتلون میں گر گئی ہو۔

اب اگر بھاگلپور کی کمشنری کا ناظر اور ہیڈ اردلی اس کے استقبال کے لئے بمبئی نہ پہنچے ہوئے، تو یہ اس کے ضعیف دل پر تیسری جدید ضرب ہوگی۔ اگر وہ نہ آئے ہو . . . . اگر وہ نہ آئے . . . . نہ آئیں۔ اپنی بلا سے۔ جان میکفرسن نے صرف دو ہی روز تو بمبئی میں ٹھہرنا تھا۔ اور گورنمنٹ ہاؤس کا دعوتی رقعہ اس کو لندن ہی میں مل گیا تھا۔

پھر بھی اگر وہ نہ آئے؟ یہ بھیانک خیال رہ رہ کر اس اس کے سینے پر سمندر کی تند لہروں کی طرح ٹکراتا تھا۔ اور دور بمبئی کے ساحل پر یکے بعد دیگرے ابھرنے والے روشنی کے نشان تاریک دھبوں میں بدل جاتے تھے۔ اگر جان میکفرسن کو یہ یقین ہوتا کہ بمبئی کے ساحل پر اترتے ہی کوئی اس کی ٹوپی اچھال کر سمندر میں پھینک دیگا، یا زبردستی اس کی پتلون اتار کر بھاگ جائیگا، تو بھی غالباً اس کے دل میں اس سے زیادہ پریشانی کا احساس نہ پیدا ہوتا جتنا کہ اب ناظر اور ہیڈ اردلی کے آنے یا نہ آنے کی بیم و رجا سے پیدا ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے بائیس برس سے ایک عظیم الشان سلطنت کو اپنے شانوں پر اٹھائے کھڑا تھا، تاکہ اس پر کبھی آفتاب غروب نہ ہو۔ اس فرض کی انجام دہی میں اس نے دن اور رات، خون اور پسینہ ایک کر دئے تھے۔ اس نے مچھروں کی پروا کی تھی نہ ملیریا کی۔ سانپوں کا خیال کیا تھا نہ بچھوؤں کا۔ سن سٹروک سے ڈرا تھا نہ ہیضے یا طاعون یا کالا آزار سے۔ اس نے اپنی جوانی کا رس، اپنے دماغ کا جوہر، اپنے قلب کا سکون بے دریغ قربان کیا تھا، تاکہ برطانیہ کے تاج میں کوہ نور کی چمک ماند نہ ہونے پائے۔ لیکن اب جبکہ اس کے آرام کے دن قریب آ رہے تھے، قدم قدم پر اسے ایک نیا دھکا لگ رہا تھا۔ بات بات پر اس کے دل پر نئے نشتر چلتے تھے۔ اب اس کی آنکھوں میں وہ پرانا نور باقی نہ تھا، جس سے وہ تاج کی دھندھلاتی ہوئی تابانی کو جلا بخش سکتا۔ نہ ہی اب اس کے کندھوں میں وہ سکت تھی جس کے



سہارے وہ اپنی سلطنت کو کبھی غروب ہونے والے آفتاب کے رخ پر سہارا دئے رکھتا --- جان میکفرسن کے سینے میں یہ خلش یوں جوش مار رہی تھی جیسے سوڈا واٹر کی بوتل کا دہانہ بھک سے پھٹ گیا ہو۔ اس کی کن پٹیوں میں خون کی گردش ابلنے لگی۔ گلے میں مچھلی کے کانٹے پھنس گئے۔ اور آنکھوں میں اتری ہوئی نمی کو چھپانے کے لئے اس نے جلدی سے آنکھوں پر دوربین لگا لی۔

"ہلو جان۔ کہو یار، آج جاتی بہار کی بازی لگے گی؟" سردار جسونت سنگھ نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ اور دوسرے ہاتھ سے تاش کی گدی کو عین اس کی ناک کے نیچے زور سے پھڑ پھڑایا۔

جان میکفرسن کو یہ حرکت بہت ناگوار گزری۔ یکایک اس کی آنکھوں میں اترے ہوئے آنسو خشک ہو گئے۔ اس کی خمیدہ گردن میں تناؤ آ گیا۔ سردار جسونت سنگھ کو کوئی جواب دئے بغیر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور غصے سے وہاں سے چلا آیا۔ لمحہ بھر کے لئے سردار جسونت سنگھ دم بخود کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر اس نے جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھ کر جائزہ لیا۔ کہ کسی اور نے تو اس کی یہ گت بنتے نہیں دیکھ لی؟ سامنے کچھ دور مسز جیکسن کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ایک زہریلی، کاٹنے والی مسکراہٹ جس میں نفرت، حقارت، اور طنز کے نشتر سانپوں کے ڈنکوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ جب سردار جسونت سنگھ کی آنکھیں اس سے چار ہوئیں، تو مسز جیکسن نے بڑے وقار، بڑے غرور سے اپنے

سر کو کئی بار جنبش دی ، کہ ہاں ، ذرا اپنی اوقات تو پہنچانو ۔ تم حد سے زیادہ بڑھ گئے تھے ۔ تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا . . . . سردار جسونت سنگھ کے سینے میں گالیوں کا ایک غبار سا اُٹھا ۔ وہ دیر تک ڈیک پر کھڑا زیر لب گالیاں نکال نکال کر اپنا سینہ ہلکا کرتا رہا ۔ لیکن اس کے دل میں غصے کا جو شعلہ بھڑک رہا تھا ، وہ کسی پہلو ٹھنڈا نہ ہوتا تھا ۔ پھر اس کے قدم اُسے بے اختیار بار روم میں لے گئے ۔ بار روم میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھ کر وہ حیران ہو گیا ، کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک باریک سی لہر ابھری ہوئی تھی ۔ کیا یہ وطن پہنچنے پر خوشی کے آنسو ہیں؟ لیکن اس کے دل کا چور پکار پکار کر اُسے جھنجھوڑ رہا تھا ، کہ سردار جسونت سنگھ ، تم اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتے ۔ یہ خوشی کے آنسو نہیں ۔ بلکہ دراصل تم رو رہے ہو ۔ کیونکہ جان میکفرسن نے تمہارے منہ پر تھوک دیا ہے ۔ اور مسز جیکسن تمہاری درگت پر جی کھول کے مسکرا رہی تھی . . . .

”بوائے ، ایک پیگ وسکی ۔“ اس نے گلا پھاڑ کر پکارا۔

”لندن پیگ صاحب، یا پٹیالہ پیگ ؟“ بارمین نے حسب معمول دریافت کیا ۔ سردار جسونت سنگھ نے خود اسے مختلف پیگوں کے پیمانے سکھائے تھے ۔ لندن پیگ سب سے چھوٹا تھا ، فرنچ پیگ اس سے زیادہ ، امریکن پیگ اُس سے بھی زیادہ ، اور پٹیالہ پیگ سب سے بڑا ، کوئی نصف گلاس کے قریب ۔

سردار جسونت سنگھ اپنے دل کی دکھتی ہوئی گہرائیوں

میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے بارمین کی بات نہ سنی۔

"لنڈن پیگ صاحب، یا پٹیالہ پیگ؟" بار مین نے دوبارہ پوچھا۔

"لنڈن پیگ کی ماں کو . . . ." سردار جسونت سنگھ نے چونک کر ایک بھدی سی گالی دی۔ دو تین پٹیالہ پیگ پی کر اس کا دل کچھ ہلکا سا ہو گیا۔ اور اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ جو گالی اس نے لنڈن پیگ کی ماں کو دی تھی، وہ اصل میں جان میکفرسن، مسز جیکسن بلکہ جزیرہ انگلستان کی ساری ماؤں کو یکساں طور پر لگتی تھی۔ اس خوشگوار احساس سے اس کے قلب اور دماغ پر کچھ آسودگی، کچھ سکون، کچھ سرور چھا گیا۔ اور وہ بار میں بیٹھا جھوم جھوم کر لنڈن پیگ کی ماں، بہن اور بیٹی کو نئی نئی اچھوتی گالیوں سے نوازتا رہا اور پٹیالہ پیگ پر پٹیالہ پیگ پیتا رہا۔

آدھی رات کے قریب جب رابرٹ لانگ جو نیویارک پوسٹ کے نامہ نگار خصوصی کی حیثیت سے ہندوستان آ رہا تھا، اپنی روزانہ ڈائری لکھنے بیٹھا۔ تو اس نے یہ قلم بند کیا:

"جہاز بمبئی کے ساحل کے عین سامنے لنگر انداز ہے۔ کل صبح دس بجے یہ بلیرڈ ہائیر میں داخل ہو کر اپنے مسافروں کو بندرگاہ پر اگل دیگا ——— جیسے مچھلی نے حضرت یونس کو اگل دیا تھا! یہ تشبیہ میری اپنی نہیں۔ بلکہ میں شاھد کے خیال کو استعمال کر رہا ہوں۔ جب کبھی وہ جہاز کی زندگی سے اکتا جاتا ھے، تو کہا کرتا ھے کہ رابرٹ پڑھو، کہ اے خدا تیرے سوا اور کوئی نہیں۔ تیری ذات پاک ھے۔

بے شک میں بہت ہی بڑا گناھگار ھوں۔ شاھد کہتا ہے، کہ جب حضرت یونس نے مچھلی کے پیٹ میں یہ دعا مانگی تھی تو اس نے انہیں ساحل پر اگل دیا تھا۔ شاید اس دعا کی مدد سے ھمیں بھی اس مگر مچھ جیسے جہاز سے جلد نجات مل جائے!"

"رات کے اندھیرے میں بمبئی میں بجلی کے قمقموں اور میرین ڈرائیو پر چلتی ھوئی موٹر کاروں کی روشنیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس وقت اس شہر میں کوئی خصوصیت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ امریکہ یا یورپ یا انگلستان کا کوئی بھی شہر ھو سکتا ہے۔ اس وقت اسے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا، کہ یہ شہر یوگیوں، مہاراجوں، گاندھی، اور جناح کی سر زمین پر واقع ہے۔"

"آج رات میں نے ایک عجیب واقع دیکھا۔ ڈنر کے بعد جب میں سب سے اوپر والے ڈیک پر حسب معمول چہل قدمی کے لئے گیا، تو ایک کونے سے سسکیوں کی لگا تار آواز آ رھی تھی۔ مجھے حیرانی ھوئی۔ کیونکہ عموماً اس وقت اس ڈیک پر میرے سوا اور کوئی نہیں ھوا کرتا۔ میں نے دیکھا، کہ جان میکفرسن ڈیک کے جنگلے پر جھکا ھوا بے اختیار بلک بلک کر رو رھا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مسز جیکسن شاید اس کی تلاش میں اوپر آئی، تو وہ بھی اس کے ساتھ مل کر رونے لگی۔ سردار جسونت سنگھ ساری شام بار میں بیٹھا ھوا شراب پیتا، گالیاں بکتا، گاتا اور دھاڑیں مار مار کر روتا رھا۔ سارا دن شاھد مجھے نظر نہیں آیا۔ رات کو ڈنر پر بھی وہ موجود

نہیں تھا - میرے دریافت کرنے پر کیبن بوائے نے بتایا کہ وہ بھی اپنے برتھ پر منہ ڈھانپے پڑا رہا ہے - شاید وہ بھی رو رہا ہو - حیرت - شاید یہ اس پر اسرار ملک کی خاصیت ہے - نہ معلوم اس کی فضا میں کتنی المناک صدیاں کپکپا رہی ہیں - میں اپنے دل پر بھی ایک عجیب سا بوجھ محسوس کر رہا ہوں - اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں - لیکن ہر لمحہ یہ بوجھ بڑھتا ہی جاتا ہے - شاید دو چار خاموش آنسو بہانے سے یہ مبہم سی خلش مٹ جائے - لیکن میں ابھی اس ماحول کا شکار نہیں ہوا . . . . "

اور عائشہ آگئی

کھوکھرا پار کے مقام پر سرحد عبور کرتے ہوئی ہندوستانی کسٹم چوکی والوں نے عبدالکریم اور اس کی بیوی کو تو جانے دیا ، لیکن ان کی تین چیزوں کو مزید تحقیق کے لئے اپنے پاس رکھ لیا - یہ تین چیزیں سنگر سوئنگ مشین ، ہرکولیس کا بائیسکل اور عبدالکریم کی جوان سال بیٹی عائشہ پر مشتمل تھیں - دو دن اور ایک رات کی منت و سماجت کے بعد بہزار دقت جب یہ چیزیں واپس ملیں تو سلائی کی مشین کے کئی کل پرزے غائب تھے - بائیسکل کی گدی، ٹائر اور ٹیوبیں ندارد تھیں - اور عائشہ ------ خیر ، یہ بھی غنیمت تھا ، کہ ان اشیا کے جو انجر پنجر باقی تھے ، واپس تو مل گئے - اب اگر اللہ نے چاہا ، تو سلائی کی مشین کے کل پرزے بھی نئے ڈلوا لئے جائینگے - بائیسکل کی گدی ، ٹائر اور ٹیوبیں بھی اور آ جائینگیں - اور عائشہ ---- ؟ عائشہ کا بھی اللہ مالک ہے- عبدالکریم کو جو ایمان غیب کی پر اسرار طاقتوں پر تھا - اس میں آج معمول سے بہت زیادہ کشف کی کیفیت جھلک رہی تھی -

جب وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچے، تو کچھ مقامی والنٹیروں نے انہیں گوشت کے سالن کا ایک پیالہ اور چار تازہ تازہ نان کھانے کو دئیے۔ سفید سفید، نرم نرم، سوندھے سوندھے نان دیکھ کر عبدالکریم نے اپنی بیوی کی ران پر چوری سے چٹکی بھری، اور سرگوشی میں کہا۔ ''میں نے کہا عائشہ کی ماں دیکھتی ہو، کیا خالص اور کرارے نان ہیں۔ اس سالی بمبئی میں کیا پڑا تھا؟ چار برس سے ستھرے آٹے کی صورت کو ترس گئے تھے۔ واہ، کیا مکھن کے پیڑے پیدا کئے ہیں میرے مولا نے!''

جب وہ ریل کے ڈبے میں سوار ہوئے، تو کچھ مسافر اپنے جان پہچان لوگوں کے ساتھ علیک سلیک میں مشغول تھے۔ ''اسلام و علیکم۔'' ''وعلیکم سلام۔'' اسلام و علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ'' ۔۔۔۔۔۔ عبدالکریم نے پھر اپنی بیوی کو جھنجھوڑا۔ ''عائشہ کی ماں، سنتی ہو؟ کیا دھوم دھڑکے کے ساتھ سلام دعا ہو رہی ہے۔ واہ، اسلام کی تو شان ہی اور ہے۔ سالی بمبئی میں تو بندے ماترم، بندے ماترم سنتے کان پک گئے تھے۔ خدا کی قسم آج تو میرا سینہ بھی جاری ہو رہا ہے۔ واہ، کیا بات ہے میرے مولا کی۔'' اور عبدالکریم نے اپنے اغل بغل بیٹھے ہوئے مسافروں کے ساتھ بڑے جوش و خروش سے ہاتھ ملاتا اور گونج گونج کر اسلام علیکم کہنا شروع کر دیا۔ اگر اس کی بیوی اسے پکڑ کر واپس نہ بٹھا لیتی تو نہ معلوم وہ کب تک اس کاروائی میں لگا رہتا۔

جب گاڑی چلی، تو عبدالکریم نے بڑے انہماک کے ساتھ

اس کے پہیوں کی گڑگڑاھٹ کو سنا ۔ باھر تار کے کھمبوں سے حساب لگا کر ٹرین کی رفتار کا جائزہ لیا ۔ ''واہ'' اس نے اپنی بیوی کو پھر جھنجھوڑا ۔ ''طوفان میل کیا چیز ھے اس کے سامنے ۔ مزا آ گیا گاڑی میں بیٹھ کر ۔ عائشہ کی ماں ، تم بھی اپنی تسبیح نکال لو ۔ اور کھلم کھلا اطمینان سے بیٹھ کر اللہ کا نام لو ۔ کیا مجال ھے کے کوئی پیچھے سے آ کر تمہاری گردن کاٹ لے ۔''

ایک اسٹیشن کے بعد دوسرا اسٹیشن آتا گیا ۔ گاڑی رکتی اور چلتی رھی ۔ مسافر اترتے اور سوار ھوتے گئے ۔ عبدالکریم کھڑکی سے منہ باھر لٹکائے اپنے ماحول کو اپنے دل ، سینے اور آنکھوں میں جذب کر رھا تھا ۔ صاف ستھری وردی والا گارڈ جس کے سر پر جناح کیپ ، ھاتھ میں سبز اور سرخ جھنڈیاں اور منہ میں سیٹی تھی۔ پلیٹ فارموں پر چیلوں کی طرح جھپٹتے ھوئے قلی ۔ بھنبھناتی ھوئی مکھیوں سے لدے ھوئے مٹھائیوں اور کھانے کے خوانچے ۔ باھر حد نگاہ تک پھیلے ھوئے میدان ۔ اکا دکا گاؤں ۔ گاؤں کے کچے پکے مکانوں میں سے نکلتا ھوا دھواں ۔ جوھڑوں پر پانی بھرتی ھوئی ۔ کپڑے دھوتی ھوئی عورتیں ۔ گرد و غبار میں اٹے ھوئے ننگ دھڑنگ بچے ۔ آسمان کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر روتے ھوئے کتے ۔ بلیاں ۔ گدھ ۔ کہیں کہیں کسی گائے یا بیل یا بھینس کی سڑی ھوئی متعفن لاش ۔ ۔ ۔ ۔ جب حیدرآباد کا اسٹیشن آیا ، تو سب سے پہلے عبدالکریم کی نگاہ ایک رنگین بورڈ پر پڑی جس پر ایک دل ھلادینے والی مارکٹائی سے بھرپور فلم کا اشتہار تھا۔

یہ دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں ۔ اسی پلیٹ فارم پر کچھ سپاہی دس بارہ ملزموں کو گھیرے میں لئے کھڑے تھے ۔ اور ایک مجسٹریٹ صاحب کرسی پر ڈٹے بر سر عام عدالت لگائے بیٹھے تھے اور بغیر ٹکیٹ سفر کرنے والوں کو دھڑا دھڑ جرمانے کی سزا سنا رہے تھے ۔ سرکار کا یہ رعب داب دیکھ کر عبدالکریم بڑا متاثر ہوا۔ اور اس نے حسب معمول اپنی بیوی کی توجہ اس طرف منعطف کرنے کے لئے اس کی ران پر چٹکی لی ۔

" عائشہ کی ماں ، انتظام ہو تو ایسا ہو ۔ سالی بمبئی میں کسی ٹکٹ بابو کی مجال ہے ، کہ بغیر ٹکٹ والوں کی روک ٹوک کرے ۔ واہ ، حکومت کا سلیقہ بھی مسلمان کے خون ہی میں ہے ۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا ، کہ یہ لالہ لوگوں کے بس کا نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ "

عائشہ کی ماں بڑی دلجمعی سے سیٹ پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی گٹھڑی سے ایک ہزار ایک منکوں والی تسبیح نکال لی تھی ۔ اور اب بڑے انہماک سے اس پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کا ورد کرنے میں مشغول تھی ۔

" عائشہ بیٹی ۔ " عبدالکریم نے اپنی بیٹی کو پکارا ۔ " دیکھتی ہو اپنی اماں کے ٹھاٹھ ۔ واہ، کیا بات ہے اپنے وطن کی ۔ بیٹی ، اس کالے صندوق سے میری ٹوپی بھی تو نکال دو ذرا ۔ اب یہاں کس سالے کا ڈر ہے۔ "

عائشہ نے میکانکی طور پر صندوق کھولا ۔ اور ٹوپی نکال کر اپنے باپ کے حوالے کی ۔ یہ ایک پرانی سرمئی رنگ کی جناح کیپ تھی، جسے پہن کر عبدالکریم کسی وقت بھنڈی بازار

کے پر جوش جلسوں میں شامل ہوا کرتا تھا ۔ لیکن اب چار سال سے یہ ٹوپی صندوق میں بند تھی ۔ اور اس پر لگا ہوا نکل کا چاند تارا زنگ آلود ہو کر ٹوپی کی رنگت کے ساتھ مل جل گیا تھا ۔

ٹوپی اوڑھ کر عبدالکریم سینہ تان کر بیٹھ گیا ۔ اور کھڑکی سے باہر اڑتی ہوئی گرد کو دیکھنے لگا ۔ عائشہ بھی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ ایک اکتائی ہوئی ، بیزار نگاہ جس کے سامنے کسی منزل کا نشان نہ ہو ۔ وہ بار بار کوشش کرتی تھی ، کہ دل ہی دل میں دعائے گنج العرش کا ورد کرے ۔ اس دعا نے اس کی بہت سی مشکلیں حل کی تھیں ۔ لیکن آج اس دعا کے الفاظ اس کے ہونٹوں پر لرز کر رہ جاتے تھے ، اور زبان تک نہ پہنچتے تھے ۔ اس کا دل بھی اندر ہی اندر پکار رہا تھا ، کہ اب یہ عظیم الاثر دعا بھی اس کی مشکل آسان نہ کر سکیگی ۔ اب وہ ایک ایسی منزل پر پر پہنچ چکی تھی ، جہاں خدا کی خدائی بھی چارہ ساز نہیں ہوتی ۔ توبہ ، یہ تو بڑا کلمۂ کفر ہے ۔ خدا کی ذات تو قادر مطلق ہے ۔ اگر وہ چاہے ، تو گردش ایام کا رخ پیچھے کی طرف موڑ دے ۔ اور زمانے کو از سر نو اس لمحے سے شروع کرے جب عائشہ ابھی کھوکھرا پار کے قریب ہندوستانی کسٹم چوکی پر نہ پہنچی تھی ۔ ۔ ۔ ۔

کراچی پہنچ کر سب سے پہلا مسئلہ سر چھپانے کی جگہ تلاش کرنے کا تھا ۔ کچھ دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی عبدالکریم نے اپنا سامان اسٹیشن کے باہر ایک فٹ پاتھ پر

جمادیا - اور عائشہ اور/اس کی ماں کو وہاں بٹھا کے مکان کی تلاش میں نکل گیا - کچھ رات گئے جب وہ لوٹا، تو دن بھر کی دوڑ دھوپ سے بہت تھکا ھوا تھا - لیکن اس کے چہرے پر بشاشت اور اطمینان کے آثار جھلکتے تھے -

" عائشہ کی ماں " عبدالکریم نے فٹ پاتھ پر پاؤں پسار کے کہا - " ھماری کراچی کے سامنے سالی بمبئی کی کچھ حقیقت ھی نہیں - تمہارے سر کی قسم ، ایسے ایسے عالیشان محل کھڑے ھیں کہ نہ کبھی دیکھے نہ سنے - ایک سے ایک بڑھ کے سیٹھ بھی موجود پڑا ھے تمہاری قسم ایک ایک سیٹھ بمبئی کے چار چار مارواڑیوں کو اپنی جیب میں ڈال سکتا ھے - اور پھر موٹریں؟ کاھے کو سالی بمبئی نے ایسی لچھے دار موٹریں دیکھی ھونگیں - پاس سے گزر جائیں ، تو سمجھو جیسے کسی نے ریشم کا تھان کھول کر سڑک پر بچھا دیا ھے - اب ذرا ٹھکانے سے بیٹھ جائیں ، تو تمہیں بھی گھما پھرا لاؤنگا - طبیعت خوش ھو جائیگی کراچی کی بہار دیکھ کر - "

" مکان کا کچھ ھوا ؟ " عائشہ کی ماں حقیقت کی طرف آئی -

" اجی ابھی کیا جلدی پڑی ھے - اللہ نے چاھا تو سب انتظام ھو جائیگا - آج میں نے گھوم پھر کر پگڑی کے ریٹ دریافت کر لئے ھیں - خدا کی قسم ، عائشہ کی ماں - سالی بمبئی کراچی کے سامنے کوئی چیز ھی نہیں - پگڑی کے جو گنڈے دار ریٹ یہاں اٹھتے ھیں ، بیچارے بمبئی والوں نے کبھی

خواب میں بھی نہ دیکھے ہونگے ۔"

عبدالکریم کا اب یہ معمول ہو گیا تھا، کہ وہ علی الصبح منہ اندھیرے چل کھڑا ہوتا ۔ کبھی بس میں بیٹھتا ۔ کبھی ٹرام میں ۔ کبھی رکشا پر ۔ کبھی پیدل ۔ کیماڑی ۔ کلفٹن ۔ بندر روڈ ۔ صدر ۔ فریئر پارک ۔ اسمبلی ھال ۔ چیف کورٹ ۔ جیل ۔ پیر الھی بخش کالونی ۔ خداد کالونی ۔ ناظم آباد ۔ منگھو پیر ۔ قائد اعظم کا مزار . . . . کوئی مقام ایسا نہ تھا جس کا اس نے بنظر غائر جائزہ نہ لیا ہو ۔ اور کوئی جائزہ ایسا نہ تھا ، جس نے اس کے خون کی گردش کو تیز اور اس کے دل کو شاد نہ کیا ہو ۔ اور تو اور عبدالکریم کو کراچی کے فقیر بھی بڑے نجیب الطرفین نظر آتے تھے ۔ جو ماچس کی ڈبیاں اور اخبار بیچ بیچ کر بڑی خوش اسلوبی سے بھیک مانگتے تھے ۔ بمبئی کی طرح نہیں ، کہ ایک سے ایک بڑا مشٹنڈا لٹھ لئے پھرتا ھے ۔ اور بھیک یوں مانگتا ھے جیسے دھمکی دیکر اپنا قرضہ وصول کر رھا ہو !

ایک روز وہ جمعہ کی نماز پڑھنے جامعہ مسجد گیا ۔ نمازیوں کا بہت ھجوم تھا ۔ مصر ، شام ، عراق ، حجاز اور ایران سے بڑے بڑے لوگ ایک کانفرنس کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے ۔ نماز کے بعد انہوں نے پاکستان کے متعلق بڑی شاندار تقریریں کیں ۔ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے ۔ لوگ اٹھ اٹھ کران کے ھاتھ چومنے لگے ۔ گلے ملنے لگے اور چاروں طرف جوش و خروش کا ایک عجیب عالم چھا گیا ۔ یہ سماں دیکھ کر عبدالکریم کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو بہنے

لگے - اور جب سب لوگ چلے گئے، تو اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں شکرانہ کے دو رکعت نفل ادا کئے -

بمبئی میں عبدالکریم کے پاس بھنڈی بازار کے عقب میں ایک چھوٹی سی کھولی تھی - ایک تاریک سا، گھناؤنا سا کمرہ - نہ کوئی برآمدہ - نہ صحن - نہ تازہ ہوا - نہ دھوپ - اور پھر ہر مہینے پورے ساڑھے دس روپے کرایہ کے ٹھیک یکم کو ادا نہ ہوں، تو سیٹھ کے گماشتے کی گھرکیاں اور دھمکیاں الگ - لیکن اس کے مقابلے میں اب کراچی میں بڑے مزے سے بسر ہوتی تھی - جس فٹ پاتھ پر اس نے پہلے روز اڈا جمایا تھا - اب وہاں کوئی ۱۲ فٹ لمبی اور ۱۰ فٹ چوڑی جگہ گھیر کر اس نے دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی لکڑی کے تختے جوڑ کر اور پرانی بوریوں کے پردے تان کر ایک چھوٹی سی کٹیا بنا لی تھی - کھلی ہوا تھی - دھوپ اور روشنی بے روک ٹوک آتی جاتی تھی- پاس ہی بجلی کا کھمبا تھا جس کے بلب کی روشنی عین اس کے کمرے پر پڑتی تھی- پانی کا نل دور نہ تھا - اور پھر نہ کرائے کا جھگڑا نہ ہر مہینے سیٹھ کے گماشتے کی چیخ - اتفاق سے آس پاس کے ہمسائے بھی شریف لوگ تھے - اور ان سب کی آپس میں بڑے اطمینان سے بسر ہوتی تھی -

بمبئی میں عبدالکریم نے بہت سے کاروبار بدلے تھے- اخیر میں جب کانگرسی حکومت نے امتناع شراب کا حکم لگایا، تو عبدالکریم کے لئے ایک مستقل ذریعہ معاش کی صورت پیدا ہو گئی تھی - ایکسائز کے عملے، دیسی شراب کشید کرنے

والوں ، اور بغیر پرمٹ کے شراب پینے والوں سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے ۔ اور وہ ان تینوں کی مناسب خدمات کے عوض اپنے لئے دو ڈھائی سو روپے ماھوار پیدا کر لیتا تھا ۔ کراچی پہنچنے کے بعد اس نے چھان بین کی تو معلوم ھوا کہ مملکت خداداد کے دارالخلافہ میں فی الحال حرمت شراب کا حکم نازل نہیں ھوا ۔

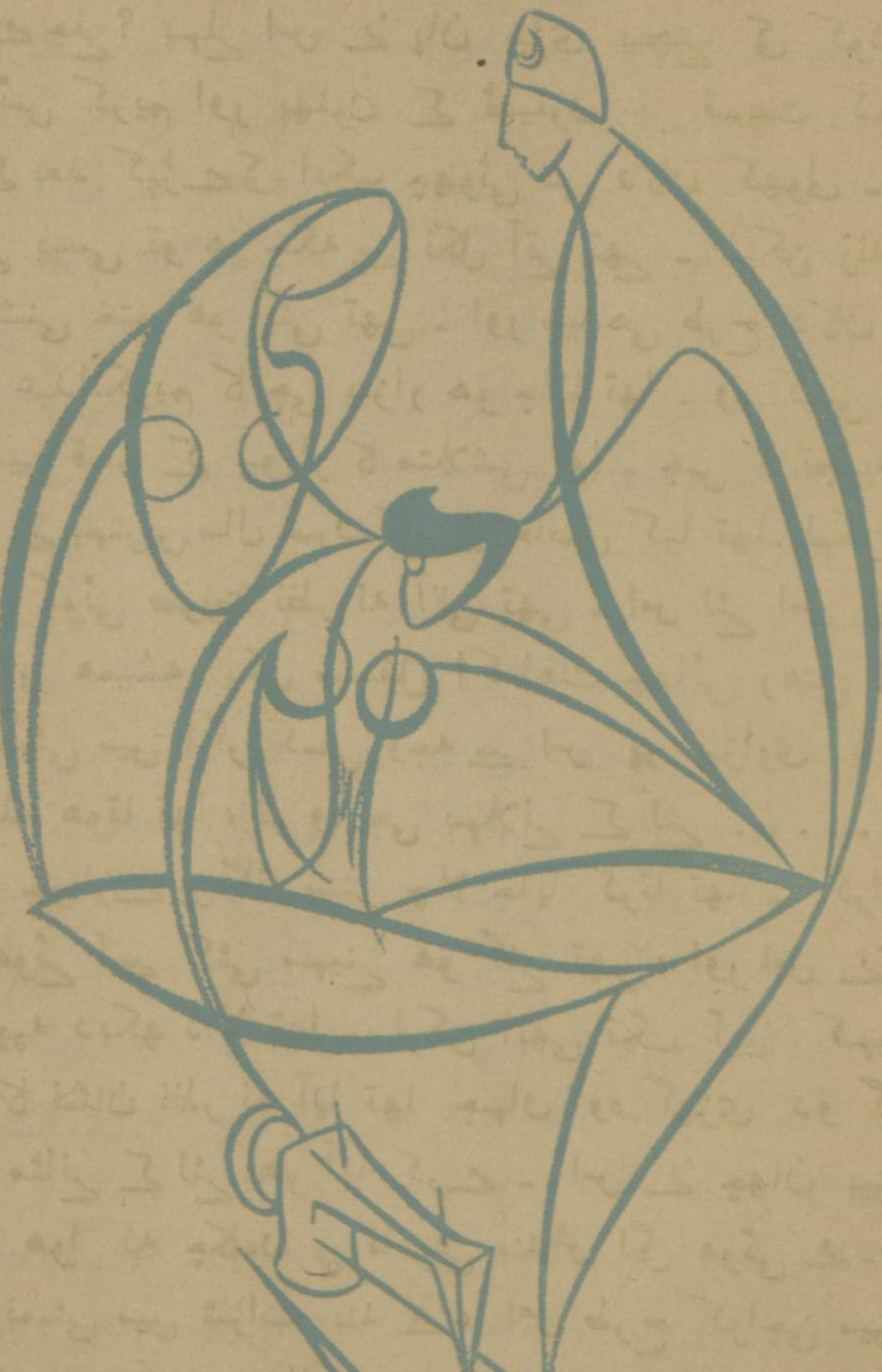
یہ دیکھ کر اس کے دل میں بہت سی بدگمانیوں نے سر اٹھایا ۔ اگرچہ وہ چور بازار میں شراب کا کاروبار کیا کرتا تھا ۔ لیکن وہ اسے ایک حرام چیز ضرور سمجھتا تھا ۔ اور اس نے خود کبھی اس کو منہ نہیں لگایا تھا ۔ جب کانگرس والوں نے شراب پر بندش کا قانون لگایا تو وہ اپنے دوستوں کے سامنے بڑی بڑی ڈینگیں مارا کرتا تھا ۔ کہ ھندؤں نے یہ کام کی بات مسلمانوں کے مذھب سے سیکھی ھے ۔ لیکن اب کراچی میں یہ دگرگوں حالت دیکھ کر اسے بڑا ذھنی صدمہ پہنچا ۔ اس نے بہت سے لوگوں سے اس کے متعلق کرید کرید کر پوچھا ، لیکن کوئی اس کی خاطر خواہ تشفی نہ کر سکا ۔ آخر ایک روز جب وہ حکیم نجیب اللہ خاں کے مطب میں بیٹھا گپیں ھانک رھا تھا ، تو باتوں باتوں میں شراب کا مسئلہ بھی چھڑ گیا ۔ حکیم صاحب اپنے محلے میں بڑے جید عالم تصور کئے جاتے تھے ، اور وہ دوا دارو کے علاوہ مسئلہ مسائل سے بھی خلق خدا کی خدمت کیا کرتے تھے ۔ عورتوں میں ھسٹریا کے مرض کو دوا کے بغیر محض روحانی وسائل سے رفع کر دینا **ان** کا خاص کمال تھا ۔ عبدالکریم کے شکوک سن کر حکیم صاحب

مسکرائے ، اور عقلی ، برھانی اور قرانی زاویوں سے شراب پر بڑی فصاحت و بلاغت سے روشنی ڈالنے لگے - ہر امر میں نیکی اور بدی دونوں کے راستے وا ہوتے ہیں - انسان کا کمال یہ ہے، کہ وہ بدی سے منہ موڑے اور نیکی کو اختیار کرے- اسی طرح شراب کے فائدے اور گناہ بھی اس کے سامنے ہیں - یہاں بھی انسان کی قوت اختیار کا امتحان ہے- شراب پر قانونی بندش لگا کر انسان کو اس امتحان سے محروم کرنا سراسر معشیت ایزدی کے خلاف ہے . . . . . .

. . . . عبدالکریم پر ان تفسیرات کا بہت اثر ہوا - اور اسلام اور ایمان اور قران کے نئے نئے اسرار اس پر منکشف ہونے لگے - " عائشہ کی ماں - " اس نے کہا - " غلامی کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟ پچاس برس ہو گئے سالی بمبئی میں رہتے - نمازیں بھی پڑھیں - قرآن شریف بھی سیکھا - لیکن کیا مجال جو کبھی سینے میں ایمان کی روشنی پیدا ہوئی ہو- اب یہاں آکر نئے نئے راز کھلنے لگے ہیں - سچ کہتے ہیں کہ ایمان کا مزا بھی آزادی کے ساتھ ہے-

" اسی لئے تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ غلام ملک میں جمعہ کی نماز تک جائز نہیں - "

شراب کی طرف سے مطمئن ہو کر عبدالکریم نے کئی دوسرے کاروباروں کی طرف رجوع کیا- لیکن اُسے اپنے چور بازار کے تجربات کام میں لانے کی کہیں کوئی صورت نظر نہ آئی - شراب ہے تو کھلم کھلا بک رہی ہے- آٹا ہے تو بر سر عام چار آنے سیر کے حساب ڈھیروں ڈھیر مل رہا ہے- کپڑے کی بھی



قلت نہیں - چینی عام ہے۔ اب چور بازار چلے تو کس چیز کے سہارے چلے؟ پہلے اس نے پان بیڑی بیچنے کی کوشش کی۔ پھر آئس کریم اور پھلوں کے ٹھیلوں پر قسمت کو آزمایا۔ اس کے بعد کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان کھولی۔ گزارے کے لئے پیسے تو ہر جگہ سے نکل آتے تھے۔ لیکن زندگیٔ عزیز کی چاشنی ختم ہو گئی تھی۔ اور سیدھی طرح دکان پر بیٹھے بیٹھے عبدالکریم کا جی بیزار ہو جاتا تھا۔ وہ کسی پر خطر، زیر زمین قسم کے بیوپار کا متلاشی تھا۔ جس کا تجربہ اس نے زندگی کے بہترین سال صرف کر کے حاصل کیا تھا۔ لیکن فی الحال اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے اس کے دل اور دماغ پر ہمیشہ ایک مستقل اکتاہٹ چھائی رہتی تھی۔

بمبئی میں اگر کسی وجہ سے اس پر بیزاری یا اکتاہٹ کا حملہ ہوتا تھا، تو وہ جی بہلانے کے لئے .... کے کسی چوبارے پر گانا سننے چلا جایا کرتا تھا۔ کراچی میں آئے ہوئے اسے کئی مہینے ہو گئے تھے، اور اس نے یہاں کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا تھا۔ لیکن ابھی تک اسے کہیں ایسے بازار کا نشان نظر نہ آیا تھا جہاں وہ گھڑی دو گھڑی کو کلفت مٹانے کے لئے ہو آیا کرے۔ اس نے چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ چکلوں پر قانونی بندش لگی ہوئی ہے۔ اور جس طرح بمبئی میں شراب بند ہے، اس طرح کراچی میں رنڈیوں کا پیشہ منع ہے۔ عبدالکریم نے یہ خبر بڑی صفائی قلب کے ساتھ عائشہ کی ماں کو سنائی۔ اور وہ دونوں دیر تک فٹ پاتھ پر اپنی جھونپڑی کے سامنے چارپائی پر بیٹھے قرآن اور ایمان

کی روح پرور باتیں کرتے رہے۔

چکلوں کے سلسلے میں جو تحقیقات عبدالکریم نے کی تھی، اس کے دوران میں اس پر یہ حقیقت کھل گئی تھی، کہ اس میدان میں بلیک مارکیٹ کے وسیع امکانات ہیں اس کی کچھ ایسے لوگوں سے شناسائی بھی ہو گئی تھی، جو اس بیوپار میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ اور عبدالکریم کے پرانے تجربات کی بنا پر اُسے معقول کمیشن پر اپنا شریک کار بنانے کے لئے آمادہ تھے۔ ایک کانے دلال نے شاید کسی وقت عائشہ کو بھی ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اس نے رائے دی کہ اگر عبدالکریم اس کی رفاقت کرے تو وہ بہت جلد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کے مالک بن جائینگے۔ جب عبدالکریم کو اس کی نیت کا علم ہوا تو اس نے اپنا جوتا کھول کر اس کانے دلال کی برسر عام خوب مرمت کی۔ اور مسجد میں جا کر ساری رات سجدے میں پڑا روتا رہا۔ کہ اے خدائے ذوالجلال۔ اس گناہ گار بندے پر رحم کر۔ کہ اس کے دل میں ایسے ذلیل کام کا خیال بھی آیا۔ یا غفور الرحیم۔ یہ اسی سیاہکارانہ خیال کی سزا ہے، کہ اب لوگ اس کی عائشہ کی طرف بھی نظریں اٹھانے لگے ہیں۔ یا اللہ توبہ۔ یا اللہ توبہ.....

رات بھر خشوع و خضوع کے ساتھ استغفار کر کے عبدالکریم کا دل پھول کی طرح ہلکا ہو گیا۔ علی الصبح منہ اندھیرے جب وہ گھر واپس لوٹا، تو اس کی بیوی انتظار کرتے کرتے چٹائی پر سو گئی تھی۔ عائشہ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن میں مصروف تھی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز، بڑا

حزن تھا ۔ اور جب وہ آہستہ آہستہ قرات کے ساتھ خدا کا کلام پڑھتی تھی، تو فضا میں ایک عجیب عرفان چھا جاتا تھا ۔ عبدالکریم خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا یہی وہ معصومیت کا فرشتہ ہے جس کے متعلق کل ایک بدمعاش دلال نے سیاہ کاری کی ہوس کی تھی؟

عبدالکریم کی توبہ اور عائشہ کی دعاؤں نے بڑا اثر دکھایا کپڑے کی دکان خوب چل نکلی ۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے عبدالکریم نے پیر الٰہی بخش کالونی میں ساڑھے چار ہزار روپے میں دو کمرے کا پختہ مکان خرید لیا ۔ زندگی میں پہلی بار عائشہ کی ماں کو اپنی ملکیت کا مکان نصیب ہوا تھا ۔ وہ اسے شیشے کی طرح صاف رکھنے لگی ۔ دن میں کئی بار سیمنٹ کا فرش دھویا جاتا ۔ دیواریں جھاڑی جاتیں ۔ اور صبح شام اندر باہر فینائل کا چھڑکاؤ ہوتا، تاکہ مکھیاں اندر نہ آنے پائیں ۔ علی الصبح منہ اندھیرے عبدالکریم کی بیوی تو مکان کی صفائی میں مصروف ہوتی ۔ اور عائشہ دالان میں بیٹھ کر قرآن پڑھتی ۔ عبدالکریم دیر تک بستر پر اپنے ماحول کے عرفان میں سرشار پڑا رہتا ۔ انڈوں، پراٹھوں اور چائے کا ناشتہ کر کے جب وہ دکان کھولتا، تو اس کا ظاہر اور باطن بڑے مطمئن اور آسودہ ہوتے تھے ۔

رفتہ رفتہ عائشہ کے لئے پیام بھی آنے لگے ۔ جس روز اس کی منگنی ہوئی، وہ بے اختیار ساری رات مصلے پر پڑی روتی رہی ۔ رخصتی کے روز وہ کئی بار روتے روتے بے ہوش ہوئی ۔ عبدالکریم اور عائشہ کی ماں کا بھی برا حال تھا ۔ عائشہ کا

خاوند بجنور کا مہاجر تھا ۔ اور ٹنڈو آدم خاں میں آڑھتی کی دکان کرتا تھا۔ جس روز وہ سسرال سدھاری، تو گویا عبدالکریم کا گھر سنسان ہو گیا ۔ دوسرے روز حسب معمول اس کی آنکھ منہ اندھیرے کھلی ۔ لیکن دالان میں عائشہ کی آواز نہ پاکر وہ کروٹ بدل کر پھر سو گیا ۔ جب وہ دن چڑھے اٹھا ، تو اس کے بدن میں بڑی آلکس تھی ۔ جیسے افیونی کو افیون یا شرابی کو شراب سے ناغہ ہو گیا ہو۔ اس نے طوعاً و کرہاً منہ ہاتھ دھویا ۔ ناشتہ کیا اور کپڑے بد کر دکان پر چلا گیا۔ دکان میں بھی اس کی طبیعت کچھ اچاٹ سی رہی ۔ اس لئے دکان کو معمول سے پہلے بند کر کے وہ جی بہلانے کے لئے گھومنے نکل گیا ۔ رات کو بہت دیر سے لوٹا۔ اور بغیر کھانا کھائے سو گیا ۔

اب اس کا یہ معمول ہو گیا تھا ، کہ صبح دیر سے اٹھتا ۔ بہت دیر سے ناشتہ کرتا ۔ کوئی دن ڈھلے دکان پر جاتا ۔ اور آدھی رات گئے گھر لوٹتا ۔ رفتہ رفتہ اس نے دکان کے لئے ایک ملازم رکھ لیا ۔ اور سارا سارا دن سونے اور رات رات بھر باہر رہنے لگا ۔ سر شام اس کے برآمدے میں کئی قسم کے دلالوں کا جمگھٹا لگ جاتا تھا ۔ ان میں وہ کانا دلال بھی ہوتا تھا جسے عبدالکریم نے ایک روز بر سر عام جوتوں سے پیٹا تھا ۔

ایک دو بار عبدالکریم کی بیوی نے ان لوگوں کے متعلق پوچھ گچھ کی ، تو اس نے بڑی صفائی سے ٹال دیا ۔ ”عائشہ کی ماں ، اب میں نے ایک دو اور بیوپار بھی کھول لئے ہیں۔

اللہ نے چاہا تو بڑی کامیابی ہوگی۔ تم ذرا جلدی سے ان بھلے آدمیوں کے لئے چائے پانی بھجوادو۔''

عبدالکریم کے نئے بیوپار بھی خوب چمک اٹھے۔ چھ سات مہینوں میں اس نے پیر الہی بخش کالونی والا مکان چھوڑ کر بندر روڈ پر ایک دو منزلہ کوٹھی خرید لی۔ صدر دروازے پر ''سیٹھ عبدالکریم بمبئی والا'' کا بورڈ لگ گیا۔ سواری کے لئے موٹر آ گئے، اور گھر میں کام کاج کے لئے نوکر چاکر مقرر ہو گئے۔ اب عائشہ کی ماں کو بھی فرصت نصیب ہوئی۔ اور وہ آدھی رات اٹھ کر تہجد گزارتی تھی۔ اور اپنی ایک ہزار ایک دانوں والی تسبیح پر اللہ کے نو سو ننانوے ناموں کا ورد کر کے اپنے شوہر کی کمائی میں برکت اور کشائش کی دعائیں کیا کرتی تھی۔

ایک رات جب عبدالکریم گھر آیا، تو عائشہ کی ماں نے اس کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔ ''اے جی، میں نے کہا، کچھ سنتے ہو؟''

''کیا بات ہے، عائشہ کی ماں؟'' عبدالکریم نے بے توجہی سے پوچھا۔ دن بھر کی ریاضت سے وہ بہت تھکا ہوا اور کسلمند تھا۔

''خیر سے ٹنڈو آدم خاں سے آدمی آیا تھا۔ اللہ رکھے، تمہاری بیٹی پر خدا نے اپنی رحمت کی ہے۔ اگلے مہینے تم بھی دادا ابا کہلانے لگو گے!''

''اللہ کا شکر ہے۔ عائشہ کی ماں، اگلی جمعرات کو یتیم خانہ کے بچوں کو بلا کر کھانا کھلا دینا۔ مجھے کام

میں یاد رہے نہ رہے۔ تم ضرور یاد رکھنا ۔ اور ہاں ، عائشہ کی ماں کچھ زیورات اور کپڑے بھی بنوا رکھو ۔ جب تم گھی کھچڑی لے کر جاؤ گی ، تو خالی ہاتھ تو نہ جاؤ گی ۔ اللہ رکھے اب دو پیسے آئے ہیں تو اپنی بیٹی پر بھی ارمان نکال لو ۔"

"اے ہے" ، عائشہ کی ماں نے تنک کر کہا ۔ "یہ تم کیسی باتیں کرتے ہو ۔ میں بھلا گھی کھچڑی لے کے کہاں جاؤنگی ۔ میری بچی اللہ رکھے بڑی الھڑ اور انجان ہے ۔ میں نے اسے دن پورے کرنے یہاں بلا لیا ہے ۔ اللہ نے چاہا تو پرسوں دوپہر کی گاڑی سے آ جائیگی ۔ تم بھی موٹر لے کر چلنا ۔ ہم عائشہ کو اسٹیشن پر لینے جائینگے ۔"

یہ خبر سن کر عبدالکریم اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ اس کی آنکھوں پر مکڑی کے جالے سے تن گئے ۔ اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گھر کے در و دیوار اس کا منہ چڑا چڑا کر پکار رہے ہوں کہ اب عائشہ آ رہی ہے ، عائشہ آ رہی ہے ، عائشہ آ رہی ہے .... وہ ساری رات بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا ۔ صبح معمول سے پہلے اٹھ بیٹھا ۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے ۔ ناشتہ کیا ۔ اور سیدھا اپنی کپڑے کی دکان پر جا بیٹھا ۔ اس کا ملازم جو پچھلے آٹھ ماہ سے تن تنہا اس دکان کو اپنے من مانے طریقہ پر چلا رہا تھا ، مالک کو آتے دیکھ کر گھبرا گیا ۔ لیکن عبدالکریم نے حساب کتاب کے متعلق کوئی باز پرس نہ کی ۔ وہ سارا دن دکان پر کھویا کھویا سا بیٹھا رہا ۔ اس کے بہت سے یار دوست اس کی تلاش میں وہاں بھی

پہنچے ۔ لیکن وہ کام کا بہانہ کر کے سب کو رکھائی سے ٹالتا رہا ۔ تیسرے پہر وہ کانا دلال بھی حسب معمول اس کی تلاش میں وہاں آیا ۔ اس کی صورت دیکھتے ہی عبدالکریم آپے سے باہر ہوگیا ۔ اور لوہے کا گز اٹھا کر دیوانہ وار اس کی طرف لپکا ۔ ''خبردار ۔ اگر تم میری دکان پر چڑھے ، تو تمہاری ٹانگیں توڑ ڈالونگا ۔ سالے حرامی نے ساری کراچی میں گندگی پھیلا رکھی ھے ۔ جاؤ بھاگو یہاں سے ۔ ورنہ ابھی پولیس کو خبر کرتا ہوں ۔ سالا دلا ....''

سر شام دکان بند کر کے عبدالکریم سیدھا مسجد میں چلا گیا ۔ اور دیر تک سجدے میں پڑا بلک بلک کر روتا رہا ۔ دعا کے کلمات رہ رہ کے اس کی زبان پر آتے تھے ، لیکن ہونٹوں پر لرز کے رہ جاتے تھے ۔ جیسے کوئی کبوتر اپنے آشیانے پر بار بار آئے اور اسے ویران پاکر پھڑ پھڑاتا ہوا واپس چلا جائے ۔ شاید عبدالکریم سجدے میں پڑے پڑے ہی سو گیا ۔ کیونکہ جب کسی نے اس کو ہلا کر جگایا ، توفجر کا وقت تھا ۔ موذن صبح کی اذان دے رہا تھا ۔ نیند کے خمار میں عبدالکریم کو یوں محسوس ہو رہا تھا ، کہ یہ اذان کی آواز نہیں ، بلکہ دور کہیں بہت دور کوئی چیخ چیخ کر پکار رہا ھے ، کہ اب عائشہ آ رہی ھے ۔ عائشہ آ رہی ھے ۔ عائشہ آ رہی ھے .....

آپ بیتی

میرا اپنا کوئی نام نہیں - لیکن مجھے ہر روز سینکڑوں نام عطا ہوتے ہیں- میرا کوئی گھر نہیں- لیکن مجھے عالیشان محلوں سے لے کر غلیظ جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے- مجھ میں غیرت اور خود داری ہے- لیکن ہمیشہ ہر قسم کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح نچایا جاتا ہوں- مجھے شہرت سے شدید نفرت ہے- لیکن کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب مجھے قصاب کی دکان پر لٹکے ہوئے گوشت کی طرح بر سر عام ننگا نہ کیا جاتا ہو- آخر انسان ہوں- اپنے بھائیوں کی طرح مرنے کی تمنا بھی رکھتا ہوں- لیکن کوئی آخری بار قطعی طور پر مرنے نہیں دیتا- رونا چاہوں تو ہنسنا پڑتا ہے- ہنسوں تو رونا لازم- خدا کی ساری خدائی میں مجھ سا مظلوم کوئی دوسرا نہیں ہے- ایک انار اور سو بیمار والا مقولہ میرے سامنے ہیچ ہے- میری حالت اس سے بھی خستہ ہے- ایک ناک ہے اور ہزاروں نکیلیں- جس طرف جھٹکا لگے بے اختیار کھنچا چلا جاتا ہوں-

نظر آنے کو تو بہت کچھ ہوں، لیکن میری حقیقت اس

سے زیادہ نہیں کہ اردو افسانے کا ایک کردار ہوں ۔ افسانہ نگار رات دن میری تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں ۔ اور جب ایک دفعہ ان کے ہاتھ آ جاؤں تو خدا کی پناہ ! نجات ملنا محال ہے ۔ بہروپیوں کی طرح میرا رنگ روغن ناک نقشہ بدل بدل کر مجھے جس طرح استعمال کیا جاتا ہے ۔ اگر اس کی تفصیل بیان کرنے بیٹھ جاؤں تو یہ خود ایک افسانہ بن جائے ۔

صبح و شام گلی کوچوں کی خاک چھاننے بھیجا جاتا ہوں ۔ اس ہیرا پھیری میں بہت سی جگہ جوتے کھاتا ہوں ۔ لیکن اس کا ذکر کسی کہانی میں نہیں ہوتا ۔ راہ چلتی عورتوں کو گھورتا ہوں ۔ ریشمی برقعوں کا تعاقب کرتا ہوں ۔ جلسوں اور جلوسوں ۔ قبرستانوں ۔ کارخانوں ۔ شہروں ۔ دیہاتوں دفتروں ۔ مسجدوں اور چور بازاروں کا مستقل طواف کرتا ہوں ۔ لیکن جو دیکھتا ہوں وہ زبان پر نہیں لا سکتا ۔ کیونکہ زبان میرے اختیار میں نہیں ۔ بلکہ افسانہ نگار کے قابو میں ہے ۔ البتہ اگر اس گھوما گھامی میں کسی بھی ایک خوبصورت عورت کا دوپٹہ ہاتھ میں آ جائے تو گالیاں افسانہ نویس کو نہیں ، مجھے پڑتی ہیں ۔ کسی کا کان یا ناک یا گردن پکڑ بیٹھوں ، تو فوجداری کا خطرہ افسانہ نگار کو نہیں مجھے لاحق ہے ۔ کہیں کسی کی ریش مبارک پر ہاتھ جا پڑے تو کفر کا فتویٰ بھی میرے ہی سر ۔ دائیں طرف بھٹک نکلوں تو رجعت پسند ۔ بائیں طرف جھکوں تو ترقی پسند ۔ دو چار ہفتے حجامت نہ بنواؤں تو کمیونسٹ ۔ دھوبی کے دھلے ہوئے

کپڑے پہن لوں سرمایہ دار۔ افسانہ نگار تو فقط افسانہ نگار ہی رہتا ہے۔ اس کھینچا تانی میں میری تکا بوٹی ہو جاتی ہے۔

پچھلے دنوں جب ہندوستان اور پاکستان پر آزادی کا نزول ہوا، تو میرے دل میں بڑے بڑے ارمانوں نے سر اٹھایا، کہ شاید یہ انقلاب عظیم مجھے ایک ایسی زندگیٔ جاویدعطا فرمائے جس کے سامنے انقلاب فرانس اور انقلاب روس کے ہیرو بھی ماند پڑ جائیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ در اصل ہوا کیا؟— اردو کے افسانہ نگاروں نے مجھے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے نکالا۔ اور پکڑ پکڑ کر کبھی ہندوؤں سے زندہ آگ میں جلوایا۔ کبھی سکھوں کی کرپانوں سے کٹوایا۔ کبھی مسلمانوں کے ہاتھوں ذبح کرایا۔ کبھی پنجاب کی ریلوں میں قتل ہوا۔ کبھی کلکتے کے بازاروں میں مارا گیا۔ اور جب اس خون کی ہولی سے افسانہ نگاروں کا جی پوری طرح بھر گیا، تو انہوں نے میرے کپڑے پھاڑ کر بال نوچ کر حال سے بے حال کر کے مہاجر کا جامہ پہنا دیا۔ اور آج تک اسی چکر میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ افسانہ نگاروں نے مجھے اس طوفان میں دھکیل تو دیا۔ لیکن اب باہر نکالنے سے قاصر ہیں۔ میں اپنی اس نئی زندگی کے بے پایاں زندگی کے بے پایاں سمندر میں کبھی ڈوبتا ہوں، کبھی ابھرتا ہوں، اور میرے آقائے نامدار افسانہ نگار بے دست و پا ساحل پر کھڑے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ——— سچ پوچھئے تو یہ مہاجر زندگی بھی بڑی کراری زندگی ہے۔ جس کو ایک

روز اس کی لت پڑ گئی ، وہ بس ہمیشہ کے لئے اسی زندگی کا حلقہ بگوش ہو کے رہ گیا - استاد ذوق کے قول کے مطابق :

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی !

یہ اسی نشے کی کشش ہے کہ جن حضرات کو ہجرت کی سعادت نصیب نہیں ہوئی ، وہ بھی جوق در جوق مہاجرین کے زمرے میں شامل ہونے کے لئے بے قرار ہیں - چنانچہ اب خدا کے فضل و کرم سے یہ حالت ہے کہ اصلی مہاجرین کے مقابلے میں ان حضرات کی تعداد کہیں زیادہ ہے جو محض تبرکاً اس سنت نبوی کو پورا کر رہے ہیں - ---- خیر یہ ایک دوسرا قصہ ہے۔ در اصل جو بات میں یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں ، وہ ایک مہاجر لڑکی کے متعلق ہے۔ آپ ضرور ناک بھویں چڑھائیں گے کہ یہ کیا بے ہودہ بکواس ہے۔ مہاجر لڑکیوں کے قصے تو ہم روز سنتے ہیں - اب یہ مضمون بند ہونا چاہیئے - بندہ پرور ! آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر در اصل مجھ سے چوک ہوئی۔ میرا مطلب یہ تھا - کہ جو چیزیں یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ محض ایک مہاجر لڑکی کے متعلق ہی نہیں بلکہ اس میں دین اور ایمان کی بھی بہت سی لا جواب باتیں ہیں - کچھ عجب نہیں کہ آپ مذہب کے نام پر بھی چیں بچیں ہوں - اگر ایسی بات ہے تو بے شک آپ کا ٹھکانا جہنم میں ہے - اور آپ میری کہانی کو ادھورا چھوڑ کر بڑے شوق سے اپنی منزل مقصود کی راہ لے سکتے ہیں - ---- جن لوگوں کے ایمان سلامت ہیں اور جن کے دلوں سے ابھی تک مہاجر لڑکیوں کی یاد فراموش نہیں ہوئی ، ان کے لئے اس قصے میں بڑے

ثواب اور بڑی حکمت کی نشانیاں ھیں -

ایک روز کا ذکر ھے کہ گاندھی گارڈن میں مزے سے گھاس پر لیٹا ھوا اونگھ رھا تھا - ھاتھ میں ایک اخبار تھا - جس میں ایک نئی مسجد کی تعمیر کے لئے چندے کی اپیل تھی- ساتھ ھی ایک ھوٹل کا اشتہار تھا کہ آج رات کی ساری آمدنی اس مسجد کے تعمیر کے لئے وقف کر دی جائیگی - یوں بھی آج کل میری گزر ھوٹلوں میں ھوتی ھے اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رھا تو مروں گا بھی ضرور ھسپتال جا کر ---- خیر اس کار ثواب میں حصہ لینے کے لئے اس شام سیدھا اشتہار والے ھوٹل پہنچا - وھاں شراب ، ڈنر اور ڈانس کا معقول انتظام تھا - اور منیجر صاحب کے کاؤنٹر پر ایک نورانی چہرے والے بریش بزرگ بھی موجود تھے - تاکہ حساب کتاب پر کڑی نگاہ رکھیں - شام کی کاروائی قرآن خوانی کی جگہ شمپین سے شروع ھوئی - میں نے جی بھر کر شراب پی - ڈنر کھایا- اور ناچ دیکھا جس میں ایک فرانسیسی رقاصہ اپنے جسم اور لباس کی آنکھ مچولی کا بڑا کمال دکھا رھی تھی - کوئی آدھی رات کے قریب جب میں ھوٹل سے باھر نکلا تو ھم خرما و ھم ثواب کے احساس سے میرا دل شاد اور روح منور تھی - یہ بھی آزادی کی برکت ھے کہ پہلے شراب نوشی پر کفر کا فتویٰ لگنے کا احتمال تھا - لیکن اب اس لال پری کے اشاروں پر مسجدوں کے مینار بلند ھوتے ھیں - اور سینوں میں ایمان کی شمع فروزاں روشن ھوتی ھے - قریب تھا کہ میں احساس تشکر سے اللہ میاں کی بارگاہ میں سجدہ بجالاؤں ، کہ یکایک

سڑک کے عین درمیان ایک رکشا والے نے مجھے تھام لیا اور میرے قدموں کی شدید لڑکھڑاہٹ دیکھ کر مجھے اپنے رکشا میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ رکشا والے کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ ہر روز آدھی رات کے وقت خلق خدا کی خدمت کرنے کا عادی ہے۔ اور خاص طور پر اسے ان حضرات کی نگہداشت کا خاص ملکہ ہے۔ جو عموماً اس ہوٹل میں تعمیر مساجد کے سلسلے میں حاضر ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ رکشا پر بیٹھتے ہی موقعہ و محل کی رعایت سے اس نے روحیانیات کا ذکر چھیڑ دیا۔ خدانخواستہ یہ بات نہیں کہ اس نے کسی وظیفہ یا درود یا کلمہ کا ورد شروع کیا۔ بلکہ حقیقت میں اس نے مہاجر چھوکریوں کے قصے چھیڑ دیئے۔ جو پانچ روپے سے لیکر پچاس روپے تک فوراً دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یہ بھی افسانہ نگاروں کی صحبت کا فیض ہے کہ میں عورت ذات کو روحانیات کا جوہر سمجھتا ہوں، کہ جس کے بغیر بجز موت اور کوئی زندگی ممکن نہیں ہے۔ ---

"سیٹھ"! رکشا والے نے مجھے بشارت دی اگر تم بیس روپے خرچ کرو تمہیں ابھی جنت کی سیر کرا لاؤں!

میں نے اس دعوت خیر کو بخوشی قبول کر لیا۔ ہوٹل میں تعمیر مسجد کے نام پر ڈنر کھا کے شراب پی کے اور روح کو گرمانے والے ناچ دیکھ کر میں نے اپنا نام جنت کے خریداروں میں تو لکھوا ہی دیا تھا۔ اب اگر صرف بیس روپے مزید صرف کر کے رہی سہی منزل بھی طے ہو سکتی ہے، "تو چشم ما روشن دل ما شاد"۔ چنانچہ میں نے رکشا والے

کو پانچ روپے انعام کا مژدہ بھی سنایا ۔ تاکہ وہ اس کارِ خیر تکمیل میں کوئی تاخیر نہ کرے ۔ اُن پانچ روپوں نے جادو کا اثر دکھایا ۔ اور رکشا راھیگروں سے الجھتی موٹروں سے بچتی بچاتی سرپٹ بھاگنے لگی ۔ پہلے سڑک کے دونوں جانب بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ پھر تنگ گلیوں میں ٹاٹ اور چٹائیوں کے چھوٹے چھونپڑے۔ ایک مقام پر ایک مسجد بھی نظر آئی ۔ مگر مجھے خیال آیا کہ لگے ھاتھوں وضو بھی کرتا چلوں ۔ لیکن رکشا والے نے مجھے اس نیک ارادے سے باز رکھا ۔ ——— ”سیٹھ“! رکشا والا تلخی سے ھنس کر بولا معلوم ھوتا ھے کہ تم بہت ہی گئے ھو۔ اگر کسی نے تم کو اس حالت میں مسجد میں پکڑ لیا ، تو مارے جوتوں کے کھوپڑی گنجی ھو جائیگی ——— مجھے اس بات پر بے حد غصہ آنا چاھیئے تھا ، لیکن نہ آیا ۔ کیونکہ میں جانتا تھا ۔ کہ بچارا رکشہ والا محض نا واقف اور نادان ھے۔ اُسے کیا خبر کہ بہت جلد اس شہر میں ایک عالیشان مسجد تعمیر ھونے والی ھے۔ جس کی بہت سے اینٹوں پر میرا نام بھی لکھا ھوا ھوگا ——— خیر ! تاریکی ، غلاظت اور بدبو کے ایک لامتناھی سلسلے میں چلتے چلتے ھم ایک جگہ جھونپڑوں کی دو رویہ قطاروں کے درمیان رک گئے ۔ یہاں جنت کے بہت سے اور متلاشیوں کی رکشائیں ، گھوڑا گاڑیاں ، موٹریں اور ٹیکسیاں بھی کیئو ، لگائے کھڑی تھیں ۔ میرا خضر راہ پانچ روپے کے انعام کی گرمی سے بہت پھرتی میں تھا ۔ وہ کھٹ سے بہشت کے ایک دروازے میں داخل ھوا ۔ اور دوسرے دروازے سے ایک

حور کو برآمد کر کے لے آیا۔ مجھے افسوس ہے، کہ افسانہ نگاروں کے فیضان صحبت سے میری زبان بہت بگڑ چکی ہے اور میں استعاروں اور تشبیہوں کے بغیر اپنا مفہوم ادا نہیں کرسکتا۔ دراصل میرا مطلب یہ ہے، کہ رکشا والا ایک جھونپڑے میں گیا اور وہاں سے اپنے ساتھ ایک لڑکی لے آیا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں اسکی صورت کا جائزہ تو نہ لے سکا۔ لیکن جب وہ رکشا میں میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی، تو میری چھٹی حس نے بے ساختہ گواہی دی کہ اگر "فردوس بروئے زمین است۔ ہمیں است و ہمیں است!" رکشا والا بھی اب مزے میں تھا۔ جھونپڑے سے وہ ایک خوشبودار پان کھا کے نکلا تھا۔ منہ میں بیڑی تھی۔ اور وہ سیٹیاں بجاتا، گاتا اور اکا دکا راہگیروں پر پان کی پیک تھوکتا تیز رفتاری سے چلا جا رہا تھا۔ کلفٹن بیچ کے ایک تاریک حصے میں پہنچ کر وہ رک گیا اور رکشا ہمارے سپرد کر کے کچھ دور پرے ریت پر منہ کے بل لیٹ کر سو گیا ——— میں نے اپنے ساتھی سے اس کا نام پوچھ کر گفتگو کی ابتدا کی ——— "راحت بیگم۔" اس نے جواب دیا ——— "گھر کہاں ہے؟" ——— امانت پور ضلع مراد آباد۔ "یہاں کیسے پہنچ گئی ہو؟" میں نے پوچھا ——— اس سوال پر وہ حیران سی ہوئی اور میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے میں نے یہ سوال پوچھ کر کوئی عجیب و غریب احمقانہ حرکت کی ہو ——— لیکن مجھے بھی افسانہ نگاروں کی ٹریننگ حاصل تھی۔ اس لئے میں نے اپنا سوال پھر دھرایا ——— "صاحب" اس نے کہا

وھاں کی زندگی بھی کوئی زندگی ھے بھلا؟ نہ جان کا خیال، نہ مال کا، خیال نہ عزت و آبرو کا بچاؤ۔ توبہ، اس سے تو موت ھی اچھی۔ ”بہت خوب“ میں نے اُسے چھیڑا یہاں پر تو بڑی عزت اور آبرو کے دن گزار رھی ھو !۔۔۔۔ ”یہاں کی دوسری بات ھے صاحب“۔ اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ”آخر یہاں پر اپنا دین تو سلامت ھے“۔۔۔۔۔ اس بات پر میری روح پھڑک اٹھی۔ اور میں نے دل ھی دل میں خدائے ذوالجلال کا شکر ادا کیا کہ اس نے آج شام مجھے تعمیر مسجد میں ھاتھ بٹانے کی سعادت عطا فرمائی۔ اسلام کا بول بالا ھو۔ دین سلامت ھے تو سب کچھ ھے۔ دین ھی ایک دولت ھے جسے زوال نہیں۔ ایک طرف سمندر کی لہروں کی آہ و بکا تھی۔ دوسری طرف ریت پر رکشا والا زور زور سے خراٹے لے رھا تھا اور وہ لڑکی کہہ رھی تھی۔ صاحب میری چھوٹی بہن اور ماں ابھی تک امانت پور ضلع مراد آباد میں ھیں، جب میرے پاس دو سو روپے جمع ھو جائینگے تو میں انہیں بھی اس دوزخ سے نکال لاؤں گی۔ میں نے اب تک ایک سو چالیس روپے بچا رکھے ھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاھا اور اس طرح کی چار پانچ راتیں اور لگ گئیں، تو صاحب دو سو روپے پورے ھونے میں کونسی دیر لگتی ھے؟ ۔۔۔۔۔ میں نے دل ھی دل میں فیصلہ کر لیا، کہ آج میں اُسے بیس کی جگہ پورے ساٹھ روپے دیدونگا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گی کہ کسی مسلمان سے پالا پڑا تھا! آخر انسان کی مدد کرنا بھی تو مسجد کی تعمیر سے کچھ کم درجے کا ثواب نہیں۔ شاید اس کا درجہ تعمیر مسجد سے بھی

کچھ بلند ہو ...... میں ابھی اسی حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا کہ یکایک دو شریف آدمی بیچ پر نمودار ہوئے۔ اور بڑی مستعدی سے ہمارے آگے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پہلے انہوں نے رکشا کو زور سے جنھجھوڑا اور پھر ہم دونوں کے خاندانوں کی کئی پشتوں کے متعلق اپنی وسیع معلومات کا اظہار فرمانے لگے۔ اس تمہید کے بعد انہوں نے ہمیں باری باری گھسیٹ کر رکشا سے باہر نکالا۔ اور بڑی تفصیل کے ساتھ ہماری تلاشی لی۔ میری پتلون کی جیب میں بٹوا تھا۔ جس میں وہ ساٹھ روپے بھی تھے۔ جنہیں میں نے ابھی ابھی ایک نیک کام میں لگانے کا ارادہ کیا تھا۔ لڑکی کی چولی سے وہ پوٹلی برآمد ہوئی جس میں اس نے ایک سو چالیس روپے بچا بچا کر رکھے تھے۔ ایک شریف آدمی نے بٹوے کو اور دوسرے شریف آدمی نے پوٹلی کو اپنی اپنی جیب میں ڈال لیا۔ پھر انہوں نے ٹھوکر مار کر رکشا والے کو جگایا وہ آنکھیں ملتا ہوا خاموشی سے اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ میرا خیال تھا کہ اب یہ لوگ ہمیں سیدھا تھانے لے جائیں گے۔ میں تھانے یا کچہری یا جیل سے مطلقاً نہیں گھبراتا۔ کیونکہ انگریزی راج میں افسانہ نگار مجھے ان مقامات پر بھیجنے کے بہت شوقین تھے۔ لیکن صد حیف! کہ ان شریف آدمیوں نے میری طرف آنکھ تک اٹھا کر نہ دیکھا۔ کیونکہ اب وہ رکشا والے کی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ برآمد کرنے میں مصروف تھے۔ اس عمل کے بعد وہ دونوں راحت بیگم کو گود میں لے کر رکشا میں بیٹھ گئے۔ رکشا ادھ موئے سانپ کی طرح آہستہ آہستہ ریت پر رینگنے لگی۔ اور پھر کلفٹن بیچ کے ایک اور ویران حصے کے اندھیرے نے اسے نگل لیا ......